عبدالغنی شیخ

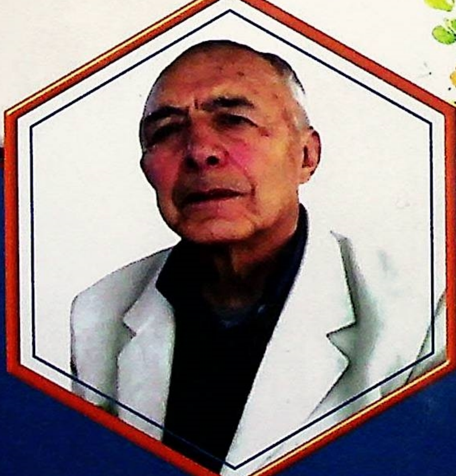
شخصیت اور ادب



مرتبہ

ڈاکٹر پریمی رومانی

مدیر سہ ماہی عالمی میراث، پونے



پیشکش

عالمی میراث پبلی کیشنز، پونے

عبدالغنی شیخ

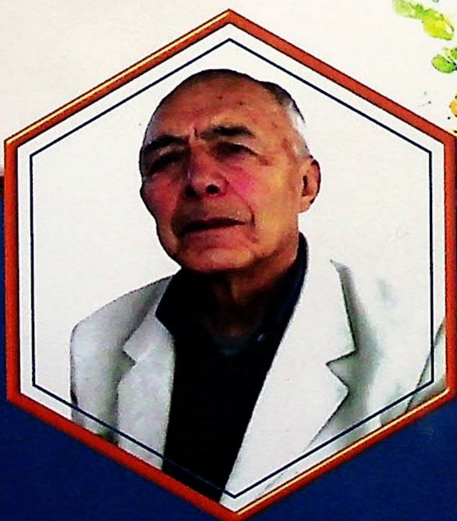
شخصیت اور ادب



مرتبہ

ڈاکٹر پریمی رومانی

مدیر سہ ماہی عالمی میراث، پونے



پیشکش

عالمی میراث پبلی کیشنز، پونے

عبدالغنی شیخ: شخصیت اور ادب

مرتبہ

ڈاکٹر پریمی رومانی

مدیر سہ ماہی عالمی میراث، پونے

پیشکش

عالمی میراث پبلی کیشنز، پونے

عبدالغنی شیخ: شخصیت اور ادب

مرتبہ

ڈاکٹر پریمی رومانی

مدیر سہ ماہی عالمی میراث، پونے

پیشکش

عالمی میراث پبلی کیشنز، پونے

نام کتاب	:	عبدالغنی شیخ۔شخصیت اور ادب
مصنف	:	عبدالغنی شیخ
مرتبہ	:	ڈاکٹر پریمی رومانی
سنہ اشاعت	:	2023
پریس	:	تاج کمپنی، دہلی
ناشر	:	عالمی میراث پبلی کیشنز، پونے
قیمت	:	400روپے

مصنف کا پتہ:۔ یاسمین، فورٹ روڈ، لیہ، لداخ

تقسیم کار

کتاب گھر لال چوک سری نگر کشمیر

عالمی میراث پبلی کیشنز، نانڈیڈسٹی پونے

پن کوڈ 411068

ترتیب

کہانیاں

کچھ لداخ کے بارے میں

طلبا کے لئے:۔

دیباچہ

عبدالغنی شیخ اردو زبان کے ایک نمائندہ افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ انہوں نے عمدہ خاکے بھی لکھے ہیں اور وہ ڈراما نگاری کے فن سے بھی کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں شیخ صاحب لداخ کے رہن سہن، تہذیب وتمدن، کلچر وادب اور زبان پر بھی معیاری کام کر چکے ہیں اور اس طرح سے انہوں نے دنیا کے اس بلند ترین مقام کے ابعاد گوشوں کو ملک اور بیرون ممالک میں اپنی تحریروں کے ذریعے سے پہنچانے کا اہم فرضہ انجام دے رہے ہیں۔ شیخ صاحب ملک اور ملک سے باہر مختلف مقامات پر سیمیناروں میں بھی متواتر حصہ لیا کرتے ہیں اور اس طرح سے لداخ کی تہذیب و تمدن اور زبان وادب کے حوالے سے لداخ کی تاریخ وتمدن کے پوشیدہ گوشوں کی اہمیت کو اجاگر کرنے کا فریضہ بھی انجام دینے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اس طرح سے وہ اپنے مادر وطن کے ایک سچے سپوت ہونے کا فرض نبھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

شیخ صاحب اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان میں بھی لکھتے ہیں۔ ان دونوں زبانوں میں ان کی بعض اہم تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں اور اس طرح سے وہ اپنے مادر وطن کا حق ادا کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔

''عبدالغنی شیخ کی شخصیت اور ادب۔'' سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ان کی شخصیت اور فن پر مقالات شامل ہیں، دوسرے، تیسرے اور چوتھے باب

میں ان کا ایک دلچسپ سفر نامہ اسلامی جمہوریہ ایران کا سفر نامہ اور انٹرویو بھی اس کتاب میں شامل ہے جو قابل مطالعہ ہے۔چوتھا باب شیخ صاحب کے پسندیدہ قلم کاروں مثلاً فیض احمد فیض، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور برج پریمی کی شخصیت اور فن کے بارے میں نہایت ہی سنجیدہ مقالات شامل کیے گئے ہیں۔اس باب کے بعد ان کے چند منتخب افسانے شامل کتاب ہیں۔آخر پر شیاچن گلیشیر کے حوالے سے ایک نہایت ہی فکر انگیز مقالہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ زیر اشاعت کتاب میں طلبا کے لئے ایک سبق آموز مقالہ ''طالب علموں سے دو باتیں''، جیسے موضوع پر ایک معنی خیز تحریریں بھی شامل ہیں۔ان تمام مقالات کا مطالعہ نہ صرف عاشقان لداخ کیلئے مفید ہے بلکہ عام پڑھنے والوں کے لئے بھی دلچسپی کا باعث ہے۔

عبدالغنی شیخ کی شخصیت اور ادب'' نہایت ہی عمدہ اور پُرکشش مقالات کا مجموعہ ہے۔جن کا مطالعہ کرنا خاص و عام کے لئے لازمی ہے۔مجھے امید ہے کہ قارئین کرام ان مقالات کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے کی زحمت کریں گے اور مجھے اپنی رائے سے نوازیں گے۔میں ذاتی طور پر آپ کی قیمتی رائے کے لئے چشم براہ رہوں گا۔

27۔اکتوبر 2023 ڈاکٹر پریمی رومانی

مدیر اعلیٰ سہ ماہی عالمی میراث پونے

D-1806, Asawari, Nanded City, Sinhagad Road, Pune,

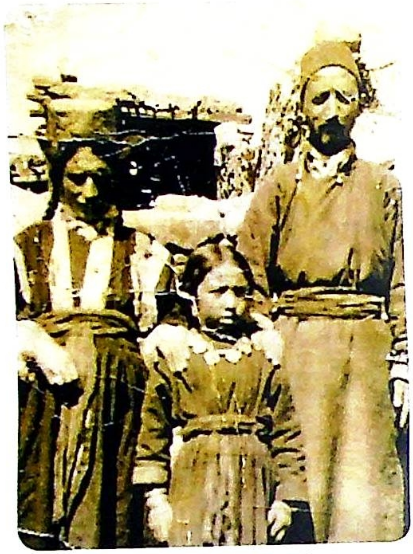
Maharashtra - 411068

Mobile No. 7889930656

عبدالغنی شیخ ۔ تصویری لمحوں میں



عبدالغنی شیخ ۔ اپنے مخصوص انداز میں



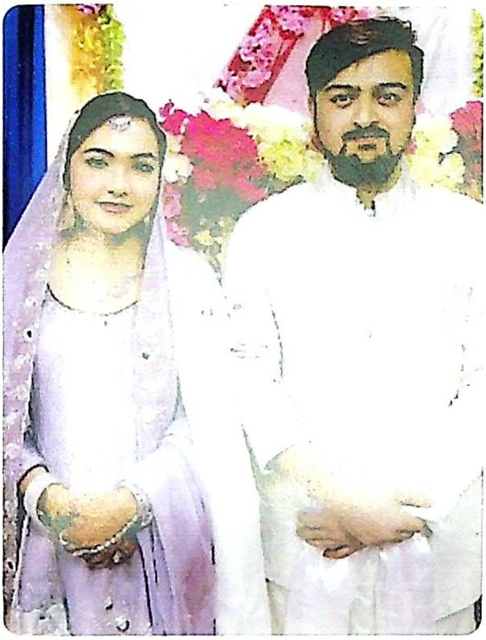
عبدالغنی شیخ کے والد مرحوم، والدہ مرحومہ اور ہمشیرہ



عبدالغنی شیخ اور ان کی اہلیہ رشتہ ازدواج کے موقعے پر لی گئی تصویر



عبدالغنی شیخ کی اہلیہ۔ اپنے روایتی لباس میں



پوتے جبران اقبال اور ڈاکٹر اسماء شاہین کی نکاح خوانی پر لی گئی تصویر



عبدالغنی شیخ اور ان کی رفیقہ حیات ۔ چند بے فکر لمحات



عبدالغنی شیخ اپنے برادر اکبر اپنی اہلیہ اور بیٹوں کے ساتھ



انٹرنیشنل ایسوسیشن فارلداخ سٹیڈیز کی ایک کانفرنس میں عبدالغنی شیخ



عبدالغنی شیخ کے اعزاز میں ریاستی کلچرل اکادمی کی ایک تقریب میں
ڈاکٹر پریمی رومانی اپنا مقالہ پیش کررہے ہیں



دیوڈی جیزو، برازیل میں ایک کانفرنس میں عبدالغنی شیخ



عبدالغنی شیخ کے ہمراہ بلتی ادیب محمد حسن حسرت اور لداخی ادیب نوانگ چھترنگ شقپو کے ساتھ



کوپن ہیگن ڈنمارک میں انٹرنیشنل ایسوسیشن فار لداخ سٹڈیز کی ایک کانفرنس میں



عبدالغنی شیخ کے ساتھ معروف قلمکار جینت رضوی اور ڈاکٹر روینہ اگروال

ہمالیائی بلندیوں کی منفرد آواز۔عبدالغنی شیخ

(دو ملک، ایک کہانی کے آئینے میں)

دیپک بدکی

ہمالیہ کی گود میں واقع شمالی ہندوستان کا علاقہ، لداخ، نہ صرف تبتی اور آریائی تہذیبوں کا سنگم رہا ہے بلکہ بین الاقوامی تجارتی شاہراہ 'سلک روٹ' سے جڑا ایک اہم مقام بھی رہا ہے۔ موسم سرما میں یہاں کا درجۂ حرارت صفر سے بیس ڈگری نیچے چلا جاتا ہے۔ ماضی میں یہ علاقہ کبھی بلتستان کا حصہ رہا جو تقسیم وطن کے بعد پاکستان میں چلا گیا اور نتیجے میں کئی زخم چھوڑ گیا۔ گو آبادی زیادہ نہیں ہے مگر جتنی بھی ہے اس میں یا تو بودھ ہیں یا پھر مسلمان اور دونوں مشترکہ تہذیب کے علمبردار ہیں۔ اردو کے ایک بے لوث خادم، عبدالغنی شیخ، جنھوں نے اپنی زندگی اردو کی بقا اور لداخی تہذیب کی بازیافت کے لیے وقف کی ہے، انھی یخ بستہ بلندیوں میں ۵ر مارچ ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے لیہہ ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر انڈین انفارمیشن سروس سے وابستہ ہو گئے جہاں وہ آل انڈیا ریڈیو کے مختلف سٹیشنوں پر کام کرتے رہے اور آخر کار آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ۲۰ر نومبر ۱۹۹۱ء کو ریٹائر ہو گئے۔ سبکدوشی کے بعد بھی انھوں نے دو سال تک لیہہ کے ایک پرائیویٹ سکول میں پرنسپل کا عہدہ سنبھالا۔

عبدالغنی شیخ بہ یک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، مضمون نگار، سوانح نگار اور تاریخ نویس ہیں مگر ان کی دلچسپی خاص طور سے افسانہ نگاری پر مرتکز رہی ہے۔ وہ اردو کے

علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی لکھتے ہیں۔ ایک سو سے زائد افسانے لکھے ہیں جو اردو کے معتبر رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کئی افسانوں کے ترجمے ہندی، انگریزی، کشمیری، تیلگو، پنجابی، گجراتی اور جرمن زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔ افسانہ نگار کے مطابق انھیں بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا شوق رہا، اردو اور انگریزی کی کتابیں پڑھ کر وہ نوٹس بناتے تھے اور سب سے پہلے ان کا ایک لطیفہ 'پیام تعلیم' میں چھپ گیا۔ 'قلم، قلمکار اور کتاب' میں فرماتے ہیں کہ ''پہلی کہانی ۱۹۵۸ء میں سرینگر سے نکلنے والے ایک رسالہ 'دلیش' میں چھپی۔ اسی سال 'دلیش' اور ایک اور رسالہ 'پمپوش' میں کئی کہانیاں چھپیں۔'' لداخ کی تاریخ، فوک لور، کلچر، نباتات اور حیوانات کے بارے میں ان کی دلچسپیاں ایک ریسرچ سکالر کی مانند رہی ہیں۔ وہ اس میدان میں نئے نئے گوشے دریافت کرتے رہے۔ اس بارے میں خود عبدالغنی شیخ 'قلم، قلم کار اور کتاب' میں رقم طراز ہیں کہ ''میں نے سنجیدہ موضوعات جیسے مذہب، فلسفہ، نفسیات وغیرہ پر بھی کتابوں سے اہم نوٹ لکھے ہیں۔ لداخ کی تاریخ اور ثقافت میرا اہم موضوع رہا ہے۔'' عبدالغنی کی تبحر علمی کے بارے میں نریندر سیٹھی فرماتے ہیں: ''ماہنامہ آج کل کے جنوری ۲۰۰۲ء کے شمارے میں آپ کا مضمون (پہلی قسط) 'قلم، قلم کار اور کتاب' پڑھا۔ بے حد پسند آیا۔ اس سے پہلے بھی ایک شمارے میں دنیا کے مشہور ترین ناولوں پر مضمون پڑھا۔ اس وقت میں اتنا ہی کہوں گا کہ میں نے شاید ہی کوئی ادیب دیکھا ہو، جس کا اتنا وسیع مطالعہ ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ عبدالغنی شیخ نے وقتاً فوقتاً اس حوالے سے بیرونی ممالک میں کئی مقامات پر اپنے مقالات پیش کیے مثلاً برازیل [۱۹۹۳ء]، بون (جرمنی) [۹۵ء]، اسلام آباد [۹۷ء]، ڈینمارک [۲۰۰۱ء]، آکسفورڈ (یوکے)، اور، روم (اٹلی) [۲۰۰۷ء]۔ آل انڈیا ریڈیو لیہہ اور سرینگر سے بھی انھوں نے لیہہ کی تاریخ اور کلچر سے

متعلق کئی فکر انگیز مقالے پیش کیے ہیں۔ کشمیر کے نامور افسانہ نگار نور شاہ نے ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

''عبدالغنی شیخ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو افسانوی ادب کو زندہ رکھا اور اپنے افسانوں میں لداخ کے اطراف میں بکھری ہوئی زندگی اور زندگی سے وابستہ ان گنت واقعات اور حالات کو ایک منفرد انداز سے سمیٹا اور پیش کیا ہے۔''

'دو ملک ایک کہانی' عبدالغنی شیخ کا تیسرا اردو افسانوں کا مجموعہ ہے جو اگست ۲۰۱۵ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ مجموعے میں ۴۵ / افسانے شامل ہیں۔ بیشتر تحریریں صنفِ افسانہ کے لوازمات کو پورا کرتی ہیں جبکہ چند ایک انشائیہ اور مزاحیہ مضامین کے زمرے میں رکھی جاسکتی ہیں۔ موصوف زمینی حقیقتوں سے گریز نہیں کرتے، وہ لداخ کی مٹی میں پیدا ہوئے ہیں، پلے بڑھے ہیں، اس لیے اس دھرتی سے جڑے مختلف کرداروں کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے اور یہاں آنے والے سیاحوں کے رویے کو سپرد قلم کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتتے۔ ان کے پاس ایک حساس اور ہمدرد دل ہے، ایک فکرمند ذہن ہے اور ایک فرض شناس ادیب کا دماغ ہے۔ ان کے یہاں انفرادی غم بھی ہے اور اجتماعی کرب بھی۔ وہ موجودہ دور کو آئینہ دکھانے کی ہر دم کوشش کرتے ہیں اور اپنے افسانوں کی وساطت سے سماج میں پل رہی بدعنوانیوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ عبدالغنی شیخ براہ راست قاری سے مخاطب ہوتے ہیں، علامتوں اور استعاروں سے گریز کرتے ہیں اور اپنے مقصد کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں موضوعات اور کرداروں کی گونا گونیت ملتی ہے اور وہ کہیں بھی خود کو نہیں دہراتے۔

افسانوی مجموعے 'دو ملک، ایک کہانی' کی کئی کہانیاں قاری کے ذہن پر مستقل نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ ٹائٹل افسانہ 'دو ملک، ایک کہانی' اس کرب کی داستان ہے جس سے ہندوستان اور پاکستان کے لوگ بٹوارے سے لے کر آج تک جو نجھ رہے ہیں۔ زمینیں بٹ گئیں، گھر بٹ گئے، رشتے بٹ گئے، اجنبی اپنے ہوگئے اور اپنے اجنبی ہوگئے۔ شومئی قسمت یہ کہ دونوں طرف حکومتوں کی کارستانیوں کے بموجب فوجیں ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تُلی ہوئی ہیں۔ چنانچہ اسی نکتے کی بازگشت افسانے کے اس فقرے میں سنائی دیتی ہے۔ ''ہندوستان اور پاکستان کی ۶۵ رسالہ مشترکہ کہانی غلط فہمیوں، نفرتوں، کدورتوں اور لڑائیوں سے بھری ہوئی ہے۔'' ایک اور افسانہ 'یادیں' ان امانتوں کا نوحہ ہے جو سرحد کے اس پار رہ گئیں اور اب صرف یادوں کی صورت میں باقی ہیں۔ اسی کرب کو افسانہ نگار نے افسانہ 'ایک خط' میں بھی بیان کیا ہے جس میں کرگل کی لڑائی اور اس کی وجہ سے مقامی باشندوں کی تباہی اور شہادت کا ذکر ہے۔ ملاحظہ کیجیے ایک اقتباس: ''۱۹۴۸ء میں کارگل اور اس کے نواح میں دونوں ملکوں میں لڑائیاں ہوئیں۔ جب پہلی جنوری ۱۹۴۹ء کو جنگ بندی ہوئی تو کارگل کے پاس لائن آف کنٹرول کے نام سے ایک ایسی لکیر کھینچ دی گئی جس نے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اولدینگ (آبائی گھر) سے الگ کر دیا۔ میرے سارے سپنے بکھر گئے۔ کبھی انسان کی کھینچی ہوئی مصنوعی لکیر کے سامنے خود انسان بے بس ہو جاتا ہے۔''

دیکھا جائے تو انسان اپنی دھرتی صرف جنگ و جدل اور فسادات کے باعث ہی نہیں چھوڑتا بلکہ اقتصادی حالات کے باعث بھی وہ ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے یا پھر نئے امکانات کی تلاش میں دربدری اختیار کرتا ہے۔ دونوں صورتوں میں انسان کو شکست و ریخت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، پھر بھی اس کی انسانیت اور مروّت برقرار رہتی ہے۔ افسانہ 'دوسری رات' میں اسے معاشی وجوہات کے سبب گاؤں چھوڑ کر شہر کا رخ

کرنا پڑتا ہے جہاں اس کا بھرم آہستہ آہستہ زائل ہوجاتا ہے۔ 'ایک فوٹو' بہت ہی خوبصورت اور اثر انگیز افسانہ ہے جس میں ایک پرانا گروپ فوٹوگراف لداخ کی کئی نسلوں کی ناسٹلجیائی تاریخ بن کر سامنے آتا ہے اور انسانی جذبات کو کھنگالنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ مجموعے کی پہلی کہانی 'یہ زندگی' سرئیلی کیفیت سے دوچار ایک آدمی کی کہانی ہے جو آخر کار اپنے خوف پر قابو پالیتا ہے۔ ایک اور درد انگیز کہانی 'صرف ایک کلومیٹر دور ہے' میں موجودہ معاشرے کے سلگتے موضوع 'اولڈ ایج کیئر' کو بڑی ہنروری کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ مذکورہ افسانے میں بوڑھے والدین اپنے بچوں کے دیدار کے لیے ترستے ہیں حالانکہ وہ کہیں امریکا یا یورپ میں رہائش پذیر نہیں ہیں بلکہ صرف ایک کلومیٹر کی دوری پر رہتے ہیں۔ اس کہانی کی ایک اور کڑی ہے افسانہ 'اپنی موت سے پہلے اولاد کو ورثہ نہیں دو' جس میں ایک بوڑھا اپنی ساری جائیداد قبل از مرگ بچوں کو بانٹ دیتا ہے جس کے بعد کوئی بھی اس کی دیکھ بھال کرنے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ افسانہ 'دھوپ چھاؤں' میں عبدالغنی شیخ اس شماریاتی معاشرے پر فوکس کرتا ہے جس میں انسان محض ایک نمبر بن کر رہ گیا ہے۔ افسانے میں متوازن غذا نہ ملنے کے باعث بچوں میں بینائی کی کمی پر روشنی ڈالی گئی ہے چنانچہ ہمارے دیش میں لاکھوں بچے ناقص تغذیہ کے شکار ہو رہے ہیں۔ ایک اور مؤثر افسانہ 'رشتے ناطے' ہے جس میں ایک دولتمند جرمن خاتون لداخ سے ایک بیوہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور اس کی بے لوث خدمت کے عوض مرنے کے بعد اس کے لیے اپنی آدھی جائیداد چھوڑ جاتی ہے۔ وہ تفریحاً کچھ دنوں کے لیے گھر آتی ہے جہاں لوگ اس کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں مگر جونہی انھیں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ساری جائیداد فلاحی کاموں کے لیے ٹرسٹ کو سونپ دی ہے تو خفا ہو جاتے ہیں اور جانے کے وقت کوئی بھی آدمی اس کو الوداع کہنے نہیں جاتا۔ افسانہ 'جینی' میں مشرقی اور مغربی ہر دو سوسائٹوں کا موازنہ کیا

گیا ہے۔ دو اقتباس:

☆ (مغرب) ''میری ماں کہتی ہے کہ میرا باپ ایک فرانسیسی ہے۔ پیرس میں ان سے ملا تھا۔ وہ وہاں گھومنے گئی تھی۔ دونوں صرف ایک ماہ اکٹھے رہے تھے۔ اس کا نام پیٹرک کیپلانی ین تھا۔''

☆ (مشرق) ''ہمارے ہاں عورت چراغ خانہ ہے جینی، شمع محفل نہیں۔ عورت کی عصمت اور عفت اس کا سب سے بڑا زیور ہے ہماری تہذیب میں عریانی اور جنسی بے راہ روی کو دخل نہیں۔'' ظاہر ہے کہ مشرق کے نرینہ عصبی سماج میں مردوں کی سوچ کچھ اسی طرح کی ہوتی ہے اور عورتیں اس کے ساتھ ایڈجسٹ کر لیتی ہیں مگر بعد میں کہنے والا خود ہی نادم ہو جاتا ہے اور اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہیں۔''میں نے مشرقی تہذیب کی پاکیزگی اور روحانی تقدس کے نام پر اس لڑکی کو گمراہ کیا ہے۔''

''غیر یقینیت' ایک دلسوز افسانہ ہے جس میں ایک لاچار غریب مزدور اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کے لیے ٹھیکیدار کے ساتھ کام کرنے کے لیے ہر سال سیزن میں لداخ چلا جاتا ہے مگر ایک مرتبہ بلندیوں کی آب و ہوا راس نہ آنے کی وجہ سے (acclimatization) بہت سخت بیمار ہو جاتا ہے اور لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ ایک اور افسانے 'حمال' میں کشمیری مزدور کی زندگی کی کشمکش اور وہ اپنی لڑکی کی شادی کے لیے کیا کیا مصیبتیں جھیلتا ہے، کو منعکس کیا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں افسانہ نگار لداخ کے کسانوں کی کسمپرسی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ: ''لداخ میں ایک کسان مقروض پیدا ہوتا ہے، مقروض جیتا ہے اور مقروض مرتا ہے۔'' (ص ۴۰)

مجموعے میں کئی افسانے سماجی، اقتصادی اور سیاسی موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ جیسے 'آزمائش' میں اغوا شدہ بچے کے باعث والدین کی المناک تصویر، 'جھنڈا والا' میں بے روزگاری سے نپٹنے کی خاطر سیاسی پارٹی کا جھنڈا تھامنا، افسر شاہی اور لال

فیتہ شاہی پر لکھی گئی کہانیاں 'راشن کارڈ' اور 'مجرب نسخہ'، فرقہ وارانہ فسادات پر مبنی کہانیاں 'ہوا' اور 'نام'، افسانہ 'انجام' میں بودھوں کی عبادت گاہ گمپا سے نادر مورتیوں کی چوری، 'مجھے یہ آدمی نہیں چاہیے' میں سوسائٹی میں دیانت دار آدمی کی نایابی، 'اداکار' میں ایک معمولی آدمی کا شہرت پانے کے بعد تکبر اور نخوت کی نمائش کرنا، 'ہیرو' میں بدلتے زمانے کے ساتھ ہیروؤں کا بدل جانا، 'معجزہ' میں میڈیکل سہولیات کی مہنگائی اور عدم دستیابی اور 'دادا جان' میں بڑھتے ہوئے کنبے کی جدوجہد۔ سماجی مسائل پر افسانہ 'جھنڈا والا' کا ایک اقتباس یہاں نقل کر رہا ہوں:

''ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت اپنی جگہ۔ باپ اپنی نوعمر بیٹی کا منہ کالا کرتا ہے۔ پھر چچا اور بیٹا اس میں شامل ہوتے ہیں اور آبروریزی جاری رہتی ہے ۔ ماں اپنے نوزائیدہ بچے کو کوڑے دان میں پھینکتی ہے۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ایک چھ سالہ بچی کی عصمت دری کرتا ہے اور پھر گلا گھونٹ کر مارتا ہے۔ قدیم روما اور یونان میں ایسی باتیں پڑھنے کو ملتی تھیں ۔ آج ہم آئے دن ایسی خبریں پڑھتے ہیں۔ عینیت پسند لوگ کہتے ہیں کہ انسان سے مایوس نہ ہو۔ انسان سے مایوس کیوں نہ ہو؟'' (ص ۵۱)

ایک اور سماجی مسئلے ناخواندگی خصوصاً نسوانی ناخواندگی کے بارے میں افسانہ 'ایک فوٹو' میں لکھتے ہیں:

'ہاں' کاٹ دنوں کوئی اپنی لڑکی کو تعلیم نہیں دیتا تھا۔ لڑکے بھی باقاعدگی سے اسکول نہیں آتے تھے ۔ گرمیوں میں بہت سارے لڑکے بھیڑ بکریاں چرانے جاتے تھے۔ آج بھی اکّا دُکّا لڑکیاں ہی پڑھتی ہیں۔'' (ص ۳۶)

افسانہ نگار کی نظر صرف لداخی سوسائٹی کی کمیوں اور خامیوں کی طرف نہیں اٹھتی ہے بلکہ وہ اپنے معاشرے کی مثبت روایتوں کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ لداخی سماج میں جہیز کی عدم موجودگی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''اچھی بات تو یہ ہے کہ لداخ میں جہیز نہیں لیا جاتا ہے۔''

(منظر نامہ ۲۷۳)

افسانہ نگار نے نفسیاتی موضوعات کو بھی چھوا ہے جیسے 'راز دل' میں تذوتیج محرمات کا اندیشہ، 'سوئمنگ پول' میں اپنی ملازمہ کی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے ظاہری فضول خرچی، 'گمشدہ' میں ماں اور معشوقہ کی محبتوں کے بیچ لٹکا ہوا آدمی، 'برتھ ڈے' میں لالچ کی عکاسی، 'مظلوم' میں نسوانی جبریت کا پوشیدہ رخ اور 'کرید' میں عورت کی بے وفائی۔ کچھ افسانے رومانی ہیں جن میں عشق کے نشیب و فراز درشائے گئے ہیں مثلاً 'ایک رات' اور 'مسکراہٹ' میں پہلی نظر میں عشق ہونا، 'بدلاؤ' میں مرتبہ کے ساتھ معشوقہ بدل لینا، 'دل ہی تو ہے' میں چھوٹی موٹی باتوں پر ناراضی اور پھر تجدید تعلقات اور 'یادیں' میں ایک شادی شدہ جوڑے کا اپنی ازدواجی کدورتوں کو بھول کر پھر سے تجدید محبت کا عزم کرنا۔ افسانہ 'مرنا تیری گلی میں' میں ایک لینڈی کتا ایک پالتو کتیا کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے مگر پالتو کتیا کی مالکہ، جو نسلی کتوں کا کاروبار کرتی ہے، نسلی امتیاز کو برقرار رکھنا چاہتی ہے، اس لیے اپنی کتیا پر ناراض ہوتی ہے کیونکہ اسے احساس ہے کہ مارکیٹ میں اس کے پلّوں کو خریدنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ دیکھا جائے تو کہانی علامتی بھی ہے کیونکہ انسان خود نسلی اور طبقاتی آگاہی رکھتا ہے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے جتن کرتا ہے۔ افسانہ 'مسافر' ہنگری کے ادیب لاجوس زیلاہی کی کہانی کا ترجمہ ہے۔

یہاں پر عبدالغنی شیخ کی انشائیہ، ظریفانہ اور طنزیہ تحریروں کا ذکر کرنا ناگزیر بنتا ہے۔ 'اکبر بادشاہ کی دوبارہ آمد' میں مغلیہ اور ہم عصر سماج کے انتظامیہ، عدلیہ اور قانون

سازیہ کا موازنہ ملتا ہے۔ ترقی سے محروم لداخ کی عکاسی 'کھودا پہاڑ نکلا چوہا' میں کی گئی ہے کہ نسلیں اس آس میں مر کھپ جاتی ہیں کہ اب کے لیہہ میں ریل گاڑی آئے گی، بجلی آئے گی اور دیگر موڈرن سہولیات میسر ہوں گی۔ 'اپنے سیل فون کو ذرا آرام دو' میں موڈرن لائف سٹائل پر طنز کیا گیا ہے کہ انسان اب رشتوں ناطوں کو بھول کر موبائل کا غلام ہو گیا ہے۔ 'منظر نامہ' افسانہ کم اور مضمون زیادہ لگتا ہے جس میں لڑکی کی شادی کی منظر کشی کی گئی ہے۔ افسانہ 'حل' ایک طرح کا رپورتاژ ہے جس میں گھر میں ہر کوئی اپنی پسند کا چینل دیکھنے کا متمنی ہے۔ ایک اور انشائیہ نما افسانہ 'نیّت' ہے جس میں ایک جرمن اپنی بیٹی کے ہمراہ ریل میں سفر کرتا ہے اور سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان مسافر یہ سوچ کر ان پر پھبتیاں اُڑاتے ہیں اور ریمارکس پاس کرتے ہیں کہ ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آئے گا۔ سفر کے اختتام پر جرمن انہی کی زبان میں ان سے مخاطب ہوتا ہے اور انھیں شرمسار ہونا پڑتا ہے۔ 'ایک انار...' میں ایم ایل سی کی سیٹ کے لیے امیدواروں کی دوڑ دھوپ کا ذکر ہے کہ وہ وزیر اعلیٰ پر دباؤ ڈالنے کے لیے اس کے نائی، دھوبی اور درزی کو بھی نہیں چھوڑتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے عبدالغنی شیخ کے افسانوں میں لداخی کلچر کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ افسانہ 'دو ملک ایک کہانی' میں وہ اس علاقے کی تاریخ سے استفادہ کرتے ہیں اور یہاں کی گنگا جمنی تہذیب کو منعکس کرتے ہیں:

> 'بلتستان اور لداخ کے لوگ نسلی، ثقافتی اور لسانی لحاظ سے
> ایک ہیں۔ دونوں کی تاریخ اور جغرافیہ میں گہری یکسانیت ہے۔
> اور تو اور لوگوں کا مزاج اور افتادِ طبیعت بھی ایک جیسی ہے۔
> انیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک دونوں خودمختار تھے۔ بلتستان
> نے لداخ کو پولو، موسیقی کے آلات اور غزل سے متعارف کرایا۔

لداخ نے بلتستان کو داستانیں اور گیت دیے۔ بلتستان لداخ کو مکھن، سوکھی خوبانیاں، گری، سلاجیت، مٹی کے نادر برتن اور زہر مہرہ کی پیالیاں فراہم کرتا تھا اور ہم بلتستان کو پشمینہ، اون اور نمک مہیا کرتے تھے۔ (ص ۱۶۴)

اسی طرح 'ایک فوٹو' میں انھوں نے کپتان کمپارٹنر کے سفر نامے Magic Ladakh سے مندرجہ ذیل عبارت مستعار لی ہے۔

''لداخی عورتیں تکلی پر اون کاتتی اور مرد رسی باٹتے ہوئے چلتے ہیں۔ بہت سارے لوگ چقمق سے آگ بناتے ہیں۔ لداخی ہمیشہ اپنے ساتھ چائے پینے کی پیالی رکھتے ہیں۔ عورتیں کمر بند سے چمچی، سوئی دان، چابیوں کا گچھا اور ایک چمٹی باندھتیں اور مرد قلم دان، چقمق، بنسری، چاقو، گوپھن اور رسی کی گانٹھ کھولنے کے لیے ایک جنگلی بکرے ہرِن کا چھوٹا سا سینگ باندھتے۔'' (ص ۱۴۱)

عبدالغنی شیخ نے بہت سے افسانوں میں لداخی کرداروں کو پیش کیا ہے جیسے صنم چھرنگ، آنگموں، سونم، دورجے اور 'ایک فوٹو' کے کئی کردار۔ لداخ چنانچہ ایک سیاحتی مرکز ہے اور غیر ممالک سے بہت سارے لوگ یہاں آتے ہیں، اس لیے فطری بات ہے کہ افسانہ نگار کو ان سے واسطہ پڑا ہوگا اور ان کی زندگیوں میں جھانکنے کا موقع ملا ہوگا۔ ان کے کئی افسانوں میں غیر ملکی کردار بھی ملتے ہیں۔ مثلاً برتھ ڈے، جینی وغیرہ۔

زیر نظر مجموعے کے افسانے پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کا نہ صرف مطالعہ وسیع ہے بلکہ ان کا مشاہدہ بھی کافی گہرا ہے۔ وہ کردار کو سمجھنے کے لیے اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ افسانوں میں منظر نگاری کا تجزیہ کرنے سے بھی اس

بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ منظر نگاری کے چند اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

☆ ''فضا خود رو جنگلی پھولوں ، جھاڑیوں اور چگلی کے پودوں کی خوشبوؤں سے رچی رہتی۔ پہاڑی ندیاں گیت سناتی تھیں۔ یہاں سے سیاچن گلیشئر تک وادی وادی پہاڑ پہاڑ میں سیاچن کے پھول کھلے ہوتے تھے۔ اسی لیے گلیشئر کا نام سیاچن پڑا ہے۔'' (پہلا خط ص ۲۰۷)

☆ دوسری مرتبہ ہم بلتستان کے اہم مقامات سکردو، شگر، اور خپلو گئے اور چھور بت درّہ پار کر کے بٹالیک کے راستے کارگل لوٹے۔ چھور بت درّے اور بٹالیک کی بلندیوں پر ۱۹۹۹ء کی گرمیوں میں پاکستانی اور ہندوستانی فوجیوں کے درمیان گھمسان لڑائی ہوئی تھی۔'' (پہلا خط ص ۲۰۷)

جہاں تک عبدالغنی شیخ کے اسلوب کا تعلق ہے، وہ بیانیہ کو اپنی تحریر کا وسیلہ بناتے ہیں۔ ان کی زبان شستہ اور عام فہم ہے۔ گنجلک اور مبہم علامتوں اور استعاروں سے وہ پرہیز کرتے ہیں، اس لیے ان کے افسانوں کو سمجھنے کے لیے قاری کو کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ قاری افسانہ شروع کرتا ہے تو پڑھ کر ہی دم لیتا ہے کہ اس میں انجام تک تجسس برقرار رہتا ہے۔ یہی خوبی ان کے افسانوں کو بلند پایہ بناتی ہے۔ البتہ کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار زمانی طور پر اپنے کینواس کو بہت پھیلا دیتا ہے اور افسانے میں کرداروں کی بہتات ہوتی ہے۔ ان کی افسانوی تکنیک کے بارے میں تنقید نگار پریمی رومانی اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''عبدالغنی شیخ کو افسانوی تکنیک پر پوری گرفت ہے۔ وہ مبہم اور غیر واضح بیانات سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے ہاں

بے جا عبارت آرائی بھی نہیں ملتی۔ وہ اپنی کہانیوں میں فلسفہ نہیں بگھارتے بلکہ بجے تلے انداز میں بات کرتے ہیں۔''

زیر نظر مجموعہ کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عبدالغنی شیخ جہاں موجودہ معاشرے کی کوتاہیوں اور ہنگامہ آرائیوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں اوران کو بیان کرنے میں کوئی گریز نہیں کرتے وہیں ان کا رویہ قنوطیت کے بدلے رجائیت کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں اس امید کے ساتھ لکھتے ہیں کہ آنے والا کل روشن اور تابناک ہوگا۔

مجموعی طور پر اگر عبدالغنی شیخ کی افسانوی کائنات پر نظر ڈالی جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے سینے میں ایک دردمند دل ہے جو غریبوں، کسانوں، مزدوروں اور پسماندہ لوگوں کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ انھیں اپنے تاریخی ورثے پر فخر ہے اور وہ لداخ کی عظمتوں کا بکھان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ موصوف انسان کی کھینچی ہوئی اس مصنوعی سرحد سے بے زار ہیں جس نے ایک ہی خاندان کے افراد کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے اور سیاسی کارستانیوں کے باعث وہ ایک دوسرے سے مل بھی نہیں پاتے۔ ان کے افسانے مقصدی ہوتے ہیں اور اپنی جلو میں کوئی نہ کوئی سیکھ چھپائے رہتے ہیں۔ ایسے دور دراز علاقے میں گذشتہ ساٹھ برسوں سے اردو کا پرچم اٹھائے عبدالغنی شیخ کے کارناموں کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ وہ لداخ کی اکلوتی آواز ہی سہی مگر توانا آواز ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آگے بھی وہ اردو ادب کی آبیاری کرتے رہیں گے۔

☆☆☆

لداخ کا ایک معروف قلمکار۔عبدالغنی شیخ

ڈاکٹر پریمی رومانی

ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں تاہم جن افسانہ نگاروں نے اپنے ذہن رسا سے اس فن کو آگے بڑھایا۔ان میں پریم ناتھ پردیسی، راما نند ساگر، قدرت اللہ شہاب، نرسنگھ داس نرگس، کشمیری لال ذاکر، ٹھاکر پونچھی، موہن یاور، برج پریمی، بنسی نردوش، دیپک کول، تیج بہادر بھان، حامدی کاشمیری، پشکر ناتھ، ہری کرشن کول، نورشاہ وغیرہ پیش پیش ہیں۔اس فہرست میں عبدالغنی شیخ کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔جنھوں نے اپنے افسانوں میں لداخ کی تہذیب اوراس کے کلچر کی بھرپور عکاسی کی اوراس موضوع میں تنوع پیدا کیا۔

عبدالغنی شیخ ۱۹۳۶ء میں دنیا کے بلند ترین مقام لیہہ لداخ میں ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں سے حاصل کی۔گھر میں افلاس اور ناداری کے سائے ابتداء سے ہی منڈلا رہے تھے لیکن ہمت اور حوصلے سے انہوں نے ان تمام حالات کا مقابلہ کیا۔میٹرک پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل نہ کرسکے۔آخر ذریعہ معاش کی تلاش میں سرینگر پہنچ گئے اور وہاں ویٹرنری اسٹاک اسسٹنٹ کی ٹرینگ حاصل کی۔یہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔اپنے مضمون 'یادوں کے لمس' میں اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے خود رقمطراز ہیں:

"۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ میں سرینگر میں ویٹرنری اسٹاک

اسسٹنٹ کی ٹریننگ حاصل کررہا تھا۔ میٹرک پاس کیا تھا۔ آگے
پڑھنے کا شوق تھا۔ لیکن غربت کی وجہ سے کالج میں داخلہ نہیں
لے سکا۔"(۱)

عبدالغنی شیخ نے زندگی میں بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ انہوں نے ملازمت کے ساتھ ساتھ پڑھنے لکھنے کا شغل بھی جاری رکھا اور اس طرح سے کئی امتحانات پرائیویٹ طور پر پاس کئے۔ اسی دوران وہ وزارت اطلاعات ونشریات کے ساتھ وابستہ ہوگئے اور یہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ مطالعہ اور کتب بینی کا چسکہ بچپن سے ہی ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا چنانچہ ابتداء سے ہی انہوں نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور افسانے لکھنے شروع کئے اور یہ سلسلہ اب تک جاری وساری ہے۔ ان کے متعدد افسانے ڈرامے، خاکے، فیچر اور مضامین ملک کے معیاری رسائل میں چھپ چکے ہیں اور مقبول عام ہو چکے ہیں۔ شیخ ترقی پسند نظریات کے حامی ہیں اور کرشن چندر سے کافی متاثر ہیں ان کے بارے میں ایک جگہ پر لکھتے ہیں:

"کرشن چندر کا نام جب لیا جاتا ہے تو ذہن باغ و بہار
ہو جاتا ہے اور آنکھوں کے سامنے جلوۂ حسن ہزار رنگ کی طرح
ایک رنگین چمن کا سماں کھینچ جاتا ہے جس میں رنگ برنگے
پھول کھلے ہیں اور شوخ وشنگ تتلیاں فضا میں جھوم رہی ہیں۔ یہ
جان دار تاثرات کرشن چندر کے خوبصورت الفاظ عطا کرتے ہیں
جو کہانیوں اور ناولوں کے روپ میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔"(۲)

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عبدالغنی شیخ شروع میں کمال لداخی کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ ان کے کئی ابتدائی افسانے اسی نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ لوسر اور آنسو ۱۹۵۸ء میں ماہنامہ 'دیش' سرینگر میں شائع ہوا جس کے ادارتی

فرائض میرے والد محترم آنجہانی ڈاکٹر برج پریمی صاحب انجام دیتے تھے۔ اس زمانے میں ملک میں اردو ادبی رسائل کا اکال تھا۔ رسائل نکلتے تھے جو گروہ بندی کا شکار ہوتے تھے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی تھی۔ ایسے میں سرینگر سے ایک ادبی رسالہ نکلنا ایک نیک فال ثابت ہوا۔ عبدالغنی شیخ (کمال لداخی) ایک نیا ادبی رسالہ دیکھ کر خوش ہوئے۔ اپنی خوشی کا اظہار وہ آنجہانی ڈاکٹر برج پریمی کے نام اپنے ۱۶/اپریل ۱۹۵۸ء کے خط میں یوں کرتے ہیں:

"گرامی نامہ ملا اور بڑی مسرت کے درمیان یہ پڑھا کہ اخبار سہ روزہ 'دیش' سرینگر نے ایک رسالہ اجرا کیا ہے۔ ایسے ہی ایک رسالے کی بڑی ضرورت تھی۔ وطن کے ادبیوں کے پاس ہمیشہ تخلیقات رہتی ہیں لیکن کوئی ایسا ادبی ماہنامہ نہیں جو مستقل طور پر ان تخلیقات سے وطن اور بیرون وطن کے لوگوں کو روشناس کرائے اور یہ کتنی المناک حقیقت ہے۔ خدا کرے ہمارا یہ ماہنامہ ہمارے سابقہ دوسرے رسائل کی طرح پہلی ہی منزل پر دم نہ توڑ دے اور سابقہ خامیوں کی تلافی کرے" (۱)

(۱۔ ماہنامہ دیش سرینگر مارچ ۱۹۵۸ء، ص ۴۰۔)

عبدالغنی شیخ بہ یک وقت ایک افسانہ نگار بھی ہیں اور ناول نگار بھی، سوانح نویس بھی اور محقق بھی لیکن افسانہ ان کا پہلا عشق ہے۔ وہ اس وقت تک متعدد افسانے لکھ چکے ہیں جو ملک کے مختلف اخبارات اور جرائد کی زینت بن چکے ہیں۔ لکھنے کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔ اپنے ادبی سفر کے آغاز کے بارے میں خود لکھتے ہیں۔

"سرینگر میں ان دنوں گاہے گاہے کسی ہوٹل یا کسی ادیب کے گھر ادبی مجلس منعقد ہوا کرتی تھی۔ جلد ہی مجھے ان کی بو باس مل گئی اور میرا ادبی ذوق مجھے ان مجلسوں میں کھینچ

لے گیا۔ ادب کا چسکا میں لیہہ سے اپنے ساتھ لایا تھا اور لکھنے کی چھوت بھی لگی تھی لیکن یہ چھوت بڑی خوبصورت اور نفع بخش تھی اس نے مجھے حوادثِ زمانے کا مقابلہ کرنے، جینے اور زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔"(۱)

'زوجی لا کے آر پار' عبدالغنی شیخ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں انہوں نے لداخ کے مختلف پہلوؤں سے نقاب کشائی کی ہے۔"(۱)

عبدالغنی شیخ کو افسانوی تیکنیک پر پوری گرفت ہے۔ وہ مبہم اور غیر واضح بیانات سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بے جا عبارت آرائی بھی نہیں ملتی۔ وہ اپنی کہانیوں میں فلسفہ نہیں بگھارتے بلکہ بجے تلے انداز میں بات کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ لداخ میں بیٹھ کر کبھی دلی یا کسی اور شہر کی بات نہیں کرتے بلکہ یہاں کے اِرد گرد کے ماحول کو ہی پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان کے کردار جانے پہچانے کردار ہوتے ہیں۔ وہ کبھی فرسودہ اور غیر متحرک کرداروں کو پیش نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کے کردار افسانے کے پلاٹ کے گرد کچھ اس طرح گھومتے ہیں کہ ایک جانی پہچانی دنیا آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ علی باقران کی کردار سازی پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"عبدالغنی شیخ کے تخلیق کردہ کردار عام زندگی سے لئے گئے ہیں اور جیتے جاگتے صحت منداور توانا لگتے ہیں۔ وہ حالات کے نابینا غلام نہیں ہیں اور سماج اور تہذیب کے بلند رتبوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ شیخ صاحب حقیقت نگاری کے قائل ہیں اور اپنے کرداروں کے احساسات نفسیات اور ماحول سے خوب واقف ہیں۔"۲

۱) ماہنامہ دیش، سرینگر ۱۹۵۸ء، ص ۵۰۔
۲) دوراہا از عبدالغنی شیخ

عبدالغنی شیخ کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع ہے۔ ان میں پیار و محبت کی دھیمی دھیمی آنچ بھی ہے اور سماجی نابراری کا احساس بھی، ظلم و تشدد کے واقعات بھی ہیں اور وطن سے محبت بھی۔ بعض کہانیوں میں بھرپور طنز ملتا ہے.........وہ سماج، سوسائٹی اور فرد پر کبھی کبھی طنز کے تیر بھی چلاتے ہیں.........شیخ صاحب کے افسانوں میں ڈرامائیت بھی ملتی ہے۔ اس ضمن میں رشتے ناطے قاتل، دل ہی تو ہے، نہتے ہاتھ ''چھنگ وغیرہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں:۔

''(جو کی شراب) کے کئی جام چڑھانے کے بعد اس کا دماغ آسمان پر پہنچ گیا اور وہ اونچی آواز میں باتیں کرنے لگا۔ عورت بار بار اس کا ساغر بھرنے لگی۔ پندرہ پیالیاں لینے کے بعد جب عورت نے خالی جام بھرنے کیلئے دوبارہ صراحی اٹھائی تو اس نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ جیب سے بٹوا نکالا اور دس دس روپے کے دو نوٹ عورت کو دیئے۔ عورت نے تین روپے واپس کر دیئے جو اس نے احتیاط سے بٹوے میں رکھ لئے۔''
(مقابلہ، ص ۱۳۔۱۴)

یا

.........''حامد رک رک کر بولنے لگا لیکن نہیں جانتی میری، جہاں میں رہتا ہوں، وہ جگہ لیہہ سے بالکل بدتر ہے۔ لیہہ میں سیاحوں کی آمد کی وجہ سے بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ یہاں موجودہ زمانے کی ساری بنیادی سہولیتیں میسر ہیں۔ لیکن میرے گاؤں

میں ابھی کوئی سہولت نہیں کوئی ریستوران نہیں، کوئی ریڈنگ روم نہیں، یہاں تک کہ بجلی بھی نہیں۔ دھول گرد، ریت میرے گاؤں کے تحفے ہیں۔ گاؤں تک سڑک بھی نہیں جاتی چنانچہ سنگ ریزوں اور دھول سے اٹی ہوئی چار کلومیٹر لمبی ایک ڈھلوان پگڈنڈی پیدل طے کرنے کے بعد ہم اپنے گھر پہنچتے ہیں۔ (آزمائش۔ ص۴۳)..................

یا

''نجمہ کی بانجھ ہونے کی بات ساس، سسر اور نندوں بھاوجوں کے بعد اب دادی اماں کی زبان پر اکثر آنے لگی تھی۔ نجمہ نے محسوس کیا کہ کچھ دن سے اس کے ساتھ گھر میں ایک سرد مہری سی برتی جا رہی ہے۔ اس نے کئی مرتبہ نندوں اور بھاوجوں کو کانا پھوسی کرتے دیکھا جب وہ اُن کے پاس جاتی، وہ خاموش ہو جاتیں۔ پہلے پہل وہ ان کی رویہ پر پریشان ہوئی لیکن اب وہ بات سمجھ گئی تھی۔ ن سرگوشیوں کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ اس کی گود پچھلے چار سال سے خالی تھی۔ اس کے ساس سسر نے کئی مرتبہ اپنے بیٹے کے اولاد کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ شروع شروع میں ان کے لہجے میں نرمی اور ہمدردی ہوتی تھی، لیکن اب ان کے لہجے میں ملامت اور تہمت جھلکتی تھی۔'' (بانجھ۔ ص۱۱۴)

عبدالغنی شیخ ایک معتبر ناول نگار بھی ہیں۔ ''وہ زمانہ'' ان کا لداخ کے ماحول اور اس کے تہذیب اور کلچر پر ایک تاریخی ناول ہے۔ ان کا دوسرا ناول 'دل ہی تو ہے' جو ۱۹۷۸ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو لداخ کی ایک

دوشیزہ کے زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے لیکن پھر جب ان کی محبت کے درمیان میں ایک اور کردار آتا ہے تو یہ کہانی نیا رُخ اختیار کرتی ہے۔ شیخ کا ناول 'دِل ہی تو ہے' سونم اور پدماں کی محبت کی داستان ہے۔ انہوں نے اس محبت کو خالص لداخ کے پس منظر میں پیش کیا ہے اور کامیابی سے زینہ بہ زینہ طے کر کے اس داستان کو ایک ایسے موڑ پر لایا جہاں خود بخود تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ دراصل سماج کا ٹکراؤ ہے۔ اس میں نیماں کا کردار داخل ہونے سے کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیہہ کے ماحول اور یورپی سیاحوں کے پس منظر میں لکھا ہوا یہ دلچسپ رومانی ناول ہے۔ عبدالغنی شیخ کی کہانیوں کا مجموعہ ''دو ملک، ایک کہانی'' اگست ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں ۴۵ کہانیاں ہیں۔ اس میں سنجیدہ کہانیاں بھی ہیں اور مزاحیہ کہانیاں بھی۔ ان کہانیوں میں عام طور پر کشمیر کے مسائل کو اُبھارا گیا ہے۔ جو قابل مطالعہ ہیں۔

عبدالغنی شیخ نے نہ صرف افسانہ نگاری اور ناول نگاری میں ہی اپنی طبیعت آزمائی ہے بلکہ انہوں نے بحیثیت ایک سوانح نویس کے بھی قابل قدر نام پیدا کیا ہے۔ ان کی کتاب 'صنم فربو' بھی ایک اچھی کوشش ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ملک کے سرکردہ انجینئر، سفیر اور سیاستدان مرحوم صنم نربو کے کارناموں کو لوگوں کے سامنے رکھا ہے۔ جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیت سے سرینگر سے لیہہ جانے والی قومی شاہراہ تعمیر کر کے ایک شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔ اُن کے ادب، ثقافت اور لداخی کلچر اور تاریخ پر متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں جو اپنی جگہ مسلم ہیں۔

☆☆☆

عبدالغنی شیخ

حیات وادبی خدمات کے رنگ وروپ

حارث حمزہ لون

ریاست جموں وکشمیر کے معروف فکشن نگار اور لداخ کی تہذیب اور تمدن پر گہری نگاہ رکھنے والے عبدالغنی شیخ لیہہ لداخ میں ۵/ مارچ ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام غلام قادر شیخ تھا جن کے آباواجداد کا ٹلیس ذریعہ معاش کی تلاش میں کشمیر سے ترکِ سکونت اختیار کر کے لیہہ لداخ میں مقیم ہو گئے تھے۔ اور والدہ کا نام ساجدہ بیگم تھا۔ غلام قادر شیخ اور ان کی شریک حیات ساجدہ بیگم نے غریبی کو قریب سے دیکھا ہے، گھر کا خرچہ چلانے کے لئے کبھی ساجدہ بیگم نے اپنے زیور فروخت کئے اور کبھی مخمل کا لباس گروی رکھ کر فاقہ کشی کو الوداع کہا۔ ان کے بطن سے تین اولادوں نے جنم لیا۔ جن میں ایک بیٹا یعنی عبدالغنی شیخ اور دو بیٹیاں یعنی فاطمہ بانو اور سلمہ بانو شامل ہے۔ ۸/اگست ۱۹۵۶ء کو عبدلغنی کے والد کا انتقال ہوا اور اسکے لگ بھگ ۲۲ سال کے بعد یعنی ۱۹۷۸ء کو ان کی والدہ محترمہ مختصر علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔

عبدالغنی شیخ نے وادی جموں وکشمیر کے لداخ کے خوبصورت قصبہ لیہہ میں جنم لیا جو لداخ اپنے ارضیائی خدوخال، رنگ برنگے اُونچے پہاڑ، تاروں بھری گہری اندھیری رات، مٹی اور غبار سے پاک دُھلی دُھلی فضا، نیلا آسمان اور اپنے تہذیب و

تمدن کے انوکھے اور دلچسپ پہلوؤں کے لئے مشہور ہے یہاں عبدالغنی شیخ نے پرورش پائی اور پروان چڑھا۔ ابتدائی تعلیم لیہہ کے مقامی اسکول سے حاصل کی۔ بچپن سے ہی کافی ذہین تھے۔ میٹرک کا امتحان بھی اسی اسکول سے سکینڈ ڈویژن میں پاس کیا جب ۱۹۵۱ء میں اس اسکول کا درجہ مڈل سے ہائی کیا گیا اور لیہہ اسکول کے پہلے میٹرک پاس طالب علم کہلائے۔ عبدالغنی شیخ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں غریبی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی اور بچپن سے اپنے والد کے ساتھ خوردہ فروشی اور میلوں، تماشوں پر خوبانی مٹھائی وغیرہ بیچنے میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اس کے بعد عبدالغنی شیخ نے کشمیر یونیورسٹی سے ادیب فاضل اور بی۔ اے، آنرس کے امتحانات امتیازی پوزیشن کے ساتھ پاس کیئے۔ اور ۱۹۷۶ء میں راجستھان یونیورسٹی سے ایم۔ اے ہسٹری کی سند حاصل کی۔ علاوہ ازیں انہوں نے انسٹی ٹیوٹ آپ ماس کمونیکشن دہلی سے صحافت میں پانچ ماہ کی ٹرینگ بھی حاصل کی۔

عبدالغنی شیخ نے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ابتدا میں ہی ڈیڑھ ماہ کے لئے بطور کلرک کی نوکری اختیار کی، اور پھر ۱۹۵۲ء میں سرینگر ویٹرنری اسٹاک اسسٹنٹ کی ٹرینگ حاصل کرنے کیلئے چلے گئے۔ وہاں ایک سال تک قیام کیا۔ ۱۹۵۴ء کو عبدالغنی شیخ نے اپنے کیریئر کا آغاز اینیمل ہسبنڈری (Animal Husbandary) میں بحثیت اسٹاک اسسٹنٹ کیا اور لیہہ ویٹنری ہسپتال میں کام کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد ریاستی سرکار نے مرکزی حکومت کے مشورے پر لداخ میں بکریوں کی افزائش کے لئے پروجیکٹ شروع کیا اور ان کو دور دراز علاقے میں تبدیل کیا گیا جہاں کوئی سہولیت میسر نہ تھی لیکن انہوں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے نوکری سے معطل کر دیئے گئے۔ اسکے بعد انہوں نے کچھ مدت کے لئے ایک تاجر سے فیروزے موتی حاصل کر کے انہیں بیچنے لگے اور سرمائی تعطیلات میں ٹیوشن دینا شروع

کیا۔ دسمبر ۱۹۵۸ء کو عبدالغنی شیخ کا بطور ہیڈ ماسٹر ضلع لیہہ کے ایک گاؤں تمسگام میں تقرر ہوا جہاں انہوں نے تقریباً چار سال تک اپنے فرائض انجام دیئے اور یہاں ان کی کارکردگی کافی اچھی رہی۔ اس کے بعد لیہہ تبدیل کئے گئے اور لیہہ اسکول میں ایک سال قیام کے بعد ان کی تقرری لیہہ میں مرکزی فیلڈ پبلسٹی محکمہ میں بطور فیلڈ پبلسٹی آفیسر ہوئی۔ اور یہ سفر ۱۹۷۰ء تک جاری رکھا۔ اسی دوران یونین پبلیک سروس کمیشن سے سنٹرل انفارمیشن سروس (CIS) کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۷۰ء کے آخر میں انہوں نے پریس انفارمیشن بیورو سرینگر میں بطور انفارمیشن اسسٹنٹ جوائن کیا۔ اس کے بعد سرینگر میں نیوز ایڈیٹر کے فرائض انجام دیئے۔ اس دوران انہوں نے انسٹی ٹیوٹ آپ ماس کمونیکشن دہلی سے پانچ ماہ کی ٹریننگ حاصل کی اور آل انڈیا ریڈیو سرینگر میں بطور نامہ نگار جوائن کیا۔ اس کے بعد ۱۹۹۱ء میں دہلی اکاش وانی کے جنرل روم میں جوائن کیا اور ۲۰ نومبر ۱۹۹۲ء کو قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر ۶ دسمبر کو اسلامیہ پبلک ہائی اسکول لیہہ میں بطور پرنسپل کام کیا۔ دو سال اس عہدے پر فائز رہنے کے بعد مستعفی ہوئے ۱۹۹۲ء میں لیہہ میں ''بزم ادب'' کے نام سے اُردو ادب کے فروغ کے لئے ایک انجمن کی بنیاد پڑی اور وہ اُس کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۲ء ہی کے آخر میں ہی لداخ مسلم ایسوسیشن کے نائب صدر مقرر ہوئے۔

عبدالغنی شیخ کی شادی یکم جولائی ۱۹۶۳ء کو ایک متوسط گھرانے کی لڑکی آمنہ بیگم سے ہوئی۔ وہ ایک نیک سیرت اور شریف النفس خاتون ہیں جس وقت آمنہ بیگم کے بیٹے کا نام اقبال احمد ہے۔ انہوں نے میڈیکل کالج سرینگر سے ایم۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کی اور محکمہ ہیلتھ سروس میں بحیثیت ڈاکٹر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کے دوسرے بیٹے کا نام شاہد لطیف ہے جو کہ لیہہ میں ہی یاسمین گیسٹ ہاوس سے وابستہ ہے اور ٹراول ایجنسی چلاتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی کا نام فرحانہ

یاسمین ہے جس نے میڈیکل کالج جموں سے ایم۔بی۔بی۔ایس کیا ہے اور محکمہ صحت میں اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔عبدالغنی شیخ کے تینوں بچوں کی شادی ہوئی ہے۔ ۲۰۰۸ء میں وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ حج بیت اللہ کے زیارت سے بھی فیضیاب ہو چکے ہیں۔۲۰۱۸ء میں عبدالغنی کی عمر ۸۲ سال کی ہوگئی ہے۔

عبدالغنی شیخ کو بچپن سے ہی علم و ادب کا ذوق تھا اور بچپن سے ہی مطالعہ ان کا معمول کا مشغلہ بن چکا تھا۔ان کے بچپن میں ایک رسالہ ''رتن'' لیہہ آتا تھا جو ان کا پسندیدہ جریدہ رہا ہے۔ان کی طالب علمی کے زمانے میں لیہہ میں کوئی لائبریری نہیں تھی اگر چہ کچھ اخبار سرینگر سے لیہہ آتے تھے لیکن تاخیر کی وجہ سے ان اخباروں کی کوئی اہمیت نہیں رہتی تھی۔ساتویں جماعت میں انہوں نے کچھ نظمیں لکھیں اور ''پیام تعلیم'' میں پہلی بار ان کا لطیفہ چھپا جس پر استادوں سے کافی داد ملی۔اس کے بعد سرینگر میں ٹریننگ کرنے کے لئے چلے آئے اور سرینگر میں آکر ان کو مختلف ادیبوں کی رہنمائی حاصل ہوئی ، مختلف ادبی مجلسوں اور مشاعروں میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ان ادیبوں میں رحمان راہی ، برج پریمی ، ساغر نظامی ، آل احمد سرور ، فراق گورکھپوری ، مولانا سید آکبر آبادی ، محمد حسن ، شکیل الرحمن ، نور شاہ ، سردار جعفری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سرینگر آکر ان کو نہ صرف کئی ادبی شخصیات سے ملنے کا موقع ملا بلکہ اپنے اندر چھپے تخلیقی مادہ کو بروئے کار لانے میں مدد ملی۔ان کا مطالعہ وسیع اور معنی خیز ہونے لگا۔اور اپنی ڈائری میں کتابوں اور ان کے مصنفین جن کا وہ مطالعہ کرتے تھے انھیں قلمبند کرنا ان کا معمول بنا تھا سال ۱۹۵۶ء میں انہوں نے اکتالیس ، ۱۹۵۷ء میں نوے اور ۱۹۶۰ سے ۲۰۰۹ء کے درمیان اوسطاً سالانہ انہوں نے ۵۶ یا ۵۵ کتابوں کا مطالعہ کیا جس کی وجہ سے جہاں ان کی علمیت میں اضافہ ہوا وہاں ان کی تخلیقی صلاحیت بھی بڑھی۔

سال ۱۹۵۸ء میں سرینگر سے نکلنے والے ایک ماہنامہ ''دیش'' میں ان کی پہلی

کہانی ''لوسر اور آنسو'' چھپی۔ان تینوں کہانیوں کا محور صرف لداخ ہے۔اس کے علاوہ اسی سال لڑکیوں کے لئے ایک ڈرامہ ''جھانسی کی رانی'' کے عنوان سے بھی لکھا۔ ۱۹۵۹ء میں گاندھی جی کی صد سالہ برسی پر گاندھی جی کی حیات اور کارناموں پر ان کے پیش کردہ مسودے پر کلچرل اکادیمی نے انھیں انعام سے نوازا۔ سرینگر کے قیام کے دوران ان کا اخبارات سے کافی رابطہ رہا اور ان کو انگریزی سے اُردو میں ترجمے کا اچھا تجربہ ہوا۔ ۱۹۷۱ء میں سرینگر سے چھپنے والے جریدہ ''ہمارا ادب'' میں ان کی کہانی ''مسکراہٹ'' شائع ہوئی، جس کا بعد میں انگریزی اور ہندی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔

عبد الغنی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں وہ بہ یک وقت مورخ بھی ہیں اور تبصرہ نگار، سوانح اور خاکہ نگار بھی، ناول نگار، افسانہ نگار، ادیب بھی اور سائنس علوم کی معلومات فراہم کرنے والے بھی، سفرنامے اور فلسفہ تعلیم پر نظر رکھنے والے بھی، اخبارات کے لئے کالم اور ریڈیائی بات چیت، ٹی وی کے لئے سیریل اور سکرپٹ لکھنے والے بھی، غرض گوناگوں شخصیت کے مالک ہونے کے سبب سے وہ ادبی دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ ایک طرف انہوں نے اردو فکشن کو ایک نیا روپ دیا تو دوسری طرف انہوں نے لداخ کی تاریخ کو زندہ رکھنے میں اہم کارنامہ انجام دیا۔عبد الغنی شیخ کے افسانوں میں فکر کا پہلو بھی ہے اور ان کے یہاں طبقاتی کشمکش، سماجی نابرابری، رشوت خوری، بھوک، افلاس اور ظلم وتشدد کے اعلیٰ نمونے بھی ہیں اور اسکے ساتھ ساتھ پیار ومحبت کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔

عبد الغنی شیخ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ لداخ کی تہذیب وثقافت تاریخ کے معتبر اور مستند مورخ اور محقق تسلیم کئے جاتے ہیں۔انہوں نے لداخ کے حوالے سے کئی اہم کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں ''لداخ۔تہذیب وثقافت''، لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے ''لداخ کی سیر''، ''لداخ محققوں اور سیاحوں کی نظر میں''،

''لداخ آزادی کے بعد'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اُردو دنیا کو لداخ کی تاریخ، ادب، طرز معاشرت، رسم و رواج، رہن سہن سے واقف کرانے میں عبدالغنی شیخ کا بڑا کارنامہ ہے۔ان کتابوں کو لکھ کر لداخ سے متعلق بہت ساری معلومات منظر عام پر آئی جو آج تک سربستہ راز تھی۔غرض اپنی تخلیقی کاوشوں سے انہوں نے اپنے آپ کو ایسے مقام پر کھڑا کر دیا جس کا ثانی کوئی نہیں۔ان کے کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ انھیں اپنے مادر وطن لداخ سے بے حد محبت ہے جس کا جابجا ذکر انہوں نے کہانیوں میں کیا ہے اور اس کے جیتے جاگتے مرقعے پیش کئے۔

عبدالغنی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''زوجی لا کے آر پار'' ۱۹۷۵ء میں منظر عام پر آیا، جس میں دس افسانے شامل ہیں۔ان میں پانچ افسانے زوجی لا کے اس پار یعنی کشمیر اور ملک کے چند خطوں سے تعلق رکھتے ہیں جہاں مصنف کو قریب سے زندگی کے کچھ پہلوؤں کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔اور پانچ کہانیاں زوجی لا کے اُس پار یعنی لداخ سے متعلق ہیں جہاں ان کی پیدائش ہوئی ہے اور جہاں کے ننگے پہاڑوں، رتیلے میدانوں اور ہریالی گھاٹیوں میں عبدالغنی شیخ جوان ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے مشہور افسانوں میں مسکراہٹ، محبوبہ، دادی اماں، دل ناداں، لوسر اور آنسو، گنجوں کی کہانی، یادگار، چکر، آرزوئیں، ٹاٹا بائی بائی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔۱۹۷۷ء میں ان کا پہلا ناول ''وہ زمانہ'' شائع ہوا۔اس ناول کی بنیاد لداخ کی تاریخ پر مبنی ہے۔۱۹۷۸ء میں ان کا دوسرا ناول ''دل ہی تو ہے'' جو ایک رومانی ناول ہے۔۱۹۸۰ء میں کلچرل اکادمی سرینگر نے اس کو بہترین اُردو ناول کے ایوارڈ سے نوازا۔اسی سال بچوں کے بین الاقوامی سال کے سلسلے میں جموں و کشمیر سرکار کی طرف سے منعقدہ ایک کتابی مقابلے میں ان کی دو کتابوں ''لداخ کی سیر'' اور ''کتابوں کی دنیا'' کو انعامات ملے، جو کہ بچوں کے لئے لکھی گئی تھیں۔

مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف سکینڈری ایجوکیشن نے ''آج کل'' ۱۹۷۴ء میں شائع لداخ سے متعلق ان کے مطبوعہ مضمون کے اقتباس کو گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کی اُردو کی درسی کتابوں میں شامل کیا ہے۔ 1981ء میں انہوں نے سرکردہ لداخی انجینئر اور لیڈر ''صنم نربو'' کی سوانح حیات لکھی۔ سال ۱۹۸۳ء کے بعد انہوں نے سرینگر سے نکلنے والے ایک ہفت روزہ اخبار ''نوائے صبح'' میں لداخ نوٹ کے عنوان سے ایک کالم لکھنا شروع کیا اور ایک سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران انہوں نے فلم ڈائریکٹر ویدراہی کی فرمائش پر لداخ کے ماضی اور حال پر ۲۶ قسطوں Episode پر مبنی ایک ٹی وی سیریل بھی لکھا۔ اسکے علاوہ ریڈیو اور ٹی وی پروگراموں کے لئے کئی اسکرپٹ لکھے۔ سمیناروں میں مقالے پڑھے اور علمی و ادبی مجلسوں میں تقریریں کیں۔ انہوں نے اُردو میں غیر ملکی کہانیوں اور ناولوں پر اپنے تاثرات اور تبصرے بھی لکھے۔

سال ۱۹۸۹ء میں عبدالغنی شیخ انٹرنیشنل ایسوسیشن فار لداخ سٹیڈیز کی دعوت پر انگلینڈ گئے۔ یہ ان کا پہلا غیر ملکی دورہ تھا، انہوں نے وہاں ''لداخ میں اسلام کی مختصر تاریخ'' کے عنوان سے ایک تقریر کی۔ ۱۹۹۲ء میں ان کی دو کہانیاں ''پس پردہ'' اور ''ماں'' چھپ گئیں۔ یہ دونوں کہانیاں ان کی اپنی ماں کے بارے میں لکھی ہوئی ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''دوراہا'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں ۲۳ افسانے شامل ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں لیہہ ڈگری کالج میں ''میں قلم کار کیسے بنا؟'' کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھا۔ سال ۱۹۹۸ء میں ان کی کہانی ''ہوا'' ماہنامہ ''شمع'' میں چھپی جس کا انگریزی، ہندی اور گجراتی میں ترجمہ ہوا۔ ڈاکٹر روینہ اگروال نے ''ہوا'' کے علاوہ بارہ کہانیوں کا اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا جو "Forsaking Paradise" کے نام سے کتاب ۲۰۰۱ء میں شائع کی گئی۔

۲۰۰۱ء میں مرکزی وزارت اطلاعات کے شعبہ پبلیکیشنز ڈویژن نے ان کی کتاب

اردو جریدہ ماہنامہ ''آج کل'' میں چھپی ہیں۔ ماہنامہ ''شیرازہ'' جموں و کشمیر کلچرا کادمی Episode ادارے کے ''قلم، قلم کار اور کتاب'' شائع کی ہے جس کی چار قسطیں سرینگر کے رسالے میں ''لداخ ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں'' کے عنوان سے ان کے طویل مضمون دو قسطوں میں شائع ہوئے جو ۱۹۰ صفحات پر مشتمل تھے۔ نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا نے اسے مزید وسعت عطا کی اور ''لداخ محققوں اور سیاحوں کی نظر میں'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس کے بعد ماہنامہ ''سائنس'' دہلی میں قرآنی آیتیں، احادیث اور جدید سائنس وغیرہ کے عنوانات سے ۱۳ قسطوں میں چھپے جنھیں بعد میں ''اسلام اور سائنس'' کے نام سے شائع کیا۔ انہوں نے اس کتاب میں مختلف قرآنی آیات و احادیث کی روشنی میں سائنس کے بارے میں جانکاری فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اور مسلم قوم کی پسماندگی کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اسی تناظر میں مغرب کی ترقی کے وجوہات کی نشان دہی کی ہے۔ ۲۰۰۵ء میں لداخ پر ان کی کتاب ''لداخ۔ تہذیب اور ثقافت'' شائع ہوئی۔ اس کتاب کے لئے مرکزی وزارت وقومی وسائل کے شعبہ کونسل برائے فروغ اُردو زبان نے طباعت کے لئے مالی امداد فراہم کی۔ یہ اُردو میں لداخ پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں مصنف نے لداخ کی تہذیب و تمدن، تاریخ، یادگار مقامات، ثقافت، مذاہب، زبان، تیوہاروں، مختلف شخصیات، لوک ادب وغیرہ پر اپنے مضامین قلمبند کیے ہیں۔

اس کے علاوہ ان کی کہانیاں مختلف رسائل و جرائد میں چھپ گئی ہیں جن میں ''پہلا خط''، ''انجام''، ''جیمی''، ''یہ زندگی''، ''فوٹو''، ''یادرفتگاں'' وغیرہ شامل ہیں۔ لیہہ ریڈیو اسٹیشن سے لداخ کی تاریخ پر ''لداخ نامہ'' کے عنوان سے ۲۶ قسطوں پر مبنی ان کی بات چیت نشر ہوئی۔ نیز دُوردرشن سرینگر کی فرمائش پر لداخ کی اہم شخصیت ''رسول گلوان'' پر ۱۳ قسطوں پر مشتمل ایک سیریل لکھا۔ لداخ میں تعلیمی اداروں اور

سیاحت پر آنے والے ملکی اور غیر ملکی طلباء کولداخ کے بارے میں لیکچر دینے کے لئے عبدالغنی شیخ کو اکثر بلایا جاتا ہے۔

سال ۲۰۰۳ء میں جموں میں ریاستی کلچرل اکادمی نے ان کی ادبی خدمات کے ضمن میں ایک پروگرام ''ملاقات'' کا اہتمام کیا جس میں ریاست کے ادیبوں نے ان سے ان کی ادبی خدمات اور زندگی کے بارے میں سوالات پوچھے۔عبدالغنی شیخ نے کئی بین الاقوامی، سمیناروں میں لداخ کی تاریخ وثقافت وغیرہ پر اپنے مقالے پیش کئے۔ ان ممالک میں فرانس، انگلینڈ، اٹلی ، جرمنی، ڈنمارک، برازیل، پاکستان، ایران ،وغیرہ شامل ہیں۔ملکی اور غیر ملکی سمیناروں میں پیش کئے گئے مقالوں کو مصنف نے "Reflectionsons on Ladakh Tibet and Central Asia" نام کی کتاب میں شائع کیا ہے۔اس کتاب کو کلچرل اکادمی نے بہترین کتاب کا ایوارڈ دیا ۔اپنی تخلیقی کاوشوں پر عبدالغنی شیخ کو متعدد خطوط اور Feedback ملا ہے جن میں عام قارئین کے علاوہ سرکردہ ادباء بھی شامل ہیں بعض ادیبوں نے اپنی کتابیں نذر کیں اور بعض رسائل کے مدیروں نے اپنے رسائل ارسال کئے، جس سے عبدالغنی شیخ کو کافی حوصلہ ملا اوران کی تحریروں میں زیادہ نکھار اور پختگی آنے لگی۔عبدالغنی شیخ اپنا تحقیقی اور تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں مصنف کا نیا افسانوی مجموعہ ''دو ملک ایک کہانی'' منظر عام پر آیا ہے جس میں ۴۵ مطبوعہ کہانیاں ہیں۔اس کے علاوہ لداخ کی تاریخ پر ان کی نئی کتاب ''لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے'' بھی شائع ہوئی ہے۔

عبدالغنی نے مختلف شخصیات پر خاکے بھی قلمبند کئے ہیں جن میں سعادت حسن منٹو ،فرید پربتی، برج پریمی، کرشن چندر، فیض احمد فیض، فضل اللہ کشمیری، اسرار الحق مجاز، رسول گلوان وغیرہ شامل ہیں۔عبدالغنی نے اپنے جادوئی قلم سے نہ صرف ان کی شخصیت کو ظاہر کیا بلکہ خاکہ نگاری میں اپنا نام کمایا ہے۔اس کے علاوہ بھی انہوں نے

مختلف اشخاص پر مضامین لکھے جن میں یوسف ٹینگ، کاچوسکندر خان، منشی عبدالستار (مجاہد آزادی) ایلی ایز رجولون، منشی سپلگیں (Spalges) میر سید علی ہمدانی وغیرہ شامل ہیں

ساتھ پڑھنے لکھنے کا شغل بھی جاری رکھا اور اس طرح سے کئی امتحانات پرائیویٹ طور پر پاس کیۓ ۔ اسی دوران وہ وزارت اطلاعات ونشریات کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور یہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ مطالعہ اور کتب بینی کا چسکہ بچپن سے ہی ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا چنانچہ ابتداء سے ہی انہوں نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں اورافسانے لکھنے شروع کیۓ اور یہ سلسلہ اب تک جاری وساری ہے۔ ان کے متعدد افسانے ڈرامے، خاکے اور مضامین ملک کے معیاری رسائل میں چھپ چکے ہیں اور مقبول عام ہو چکے ہیں۔ شیخ ترقی پسند نظریات کے حامی ہیں اور کرشن چندر سے کافی متاثر ہیں ان کے بارے میں ایک جگہ پر لکھتے ہیں:

> ”کرشن چندر کا نام جب لیا جاتا ہے تو ذہن باغ وبہار ہو جاتا ہے اور آنکھوں کے سامنے جلوۂ حسن ہزار رنگ کی طرح ایک رنگین چمن کا سماں کھینچ جاتا ہے جس میں رنگ برنگے پھول کھلے ہیں اور شوخ وشنگ تتلیاں فضا میں جھوم رہی ہیں۔ یہ جان دار تاثرات کرشن چندر کے خوبصورت الفاظ عطا کرتے ہیں جو کہانیوں اور ناولوں کے روپ میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔“ (۲)

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عبدالغنی شیخ شروع میں کمال لداخی کے قلمی نام سے لکھتے تھے ۔ ان کے کئی ابتدائی افسانے اسی نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ لوسر اور آنسو ۱۹۵۸ء میں ماہنامہ 'دیش' سرینگر میں شائع ہوا جس کے ادارتی فرائض میرے والد محترم آنجہانی ڈاکٹر برج پریمی صاحب انجام دیتے تھے ۔ اس

زمانے میں ملک میں اردو ادبی رسائل کا اکال تھا۔ رسائل نکلتے تھے جو گروہ بندی کا شکار ہوتے تھے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی تھی۔ ایسے میں سرینگر سے ایک ادبی رسالہ نکلنا ایک نیک فال ثابت ہوا۔ عبدالغنی شیخ (کمال لدداخی) ایک نیا ادبی رسالہ دیکھ کر خوش ہوئے۔ اس خوشی کا اظہار وہ آنجہانی برج پریمی کے نام اپنے ۱۶/اپریل ۱۹۵۸ء کے خط میں یوں کرتے ہیں:

''گرامی نامہ ملا اور بڑی مسرت کے درمیان یہ پڑھا کہ اخبار سہ روزہ 'دیش' سرینگر نے ایک رسالہ اجرا کیا ہے۔ ایسے ہی ایک رسالے کی بڑی ضرورت تھی۔ وطن کے ادبیوں کے پاس ہمیشہ تخلیقات رہتی ہیں لیکن کوئی ایسا ادبی ماہنامہ نہیں جو مستقل طور پر ان تخلیقات سے وطن اور بیرون وطن کے لوگوں کو روشناس کرائے اور یہ کتنی المناک حقیقت ہے۔ خدا کرے ہمارا یہ ماہنامہ ہمارے سابقہ دوسرے رسائل کی طرح پہلی ہی منزل پر دم نہ توڑ وے اور سابقہ خامیوں کی تلافی کرے''(۱)

(۱۔ ماہنامہ دیش سرینگر مارچ ۱۹۵۸ء، ص ۴۰۔)

عبدالغنی شیخ بہ یک وقت ایک افسانہ نگار بھی ہیں اور ناول نگار بھی، سوانح نویس بھی اور محقق بھی لیکن افسانہ ان کا پہلا عشق ہے۔ وہ اس وقت تک متعدد افسانے لکھ چکے ہیں جو ملک کے مختلف اخبارات اور جرائد کی زینت بن چکے ہیں۔ لکھنے کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔ اپنے ادبی سفر کے آغاز کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں۔

''سرینگر میں ان دنوں گاہے گاہے کسی ہوٹل یا کسی ادیب کے گھر ادبی مجلس منعقد ہوا کرتی تھی۔ جلد ہی مجھے ان کی بو باس مل گئی اور میرا ادبی ذوق مجھے ان مجلسوں میں کھینچ لے گیا۔ ادب کا چسکا میں لیہہ سے اپنے ساتھ لایا تھا اور لکھنے کی چھوٹ بھی لگی تھی

لیکن یہ چھوت بڑی خوبصورت اور نفع بخش تھی اس نے مجھے حوادثِ زمانے کا مقابلہ کرنے، جینے اور زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔"(۱)

'زوجی لا کے آرپار' عبدالغنی شیخ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔اس میں انہوں نے لداخ کے مختلف پہلوؤں سے نقاب کشائی کی ہے۔"(۱)

عبدالغنی شیخ کو افسانوی تیکنیک پر پوری گرفت ہے۔ وہ مبہم اور غیر واضح بیانات سے گریز کرتے ہیں۔ان کے ہاں بے جا عبارت آرائی بھی نہیں ملتی۔ وہ اپنی کہانیوں میں فلسفہ نہیں بگھارتے بلکہ جچے تلے انداز میں بات کرتے ہیں۔ان کے افسانوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ لداخ میں بیٹھ کر کبھی دلی یا کسی اور شہر کی بات نہیں کرتے بلکہ یہاں کے اِرد گرد کے ماحول کو پیش ہی کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ان کے کردار جانے پہچانے کردار ہوتے ہیں۔ وہ کبھی فرسودہ اور غیر متحرک کرداروں کو پیش نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کے کردار افسانے کے پلاٹ کے گرد کچھ اس طرح گھومتے ہیں کہ ایک جانی پہچانی دنیا آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔علی باقر ان کی کردار سازی پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

> "عبدالغنی شیخ کے تخلیق کردہ کردار عام زندگی سے لئے گئے ہیں اور جیتے جاگتے صحت منداور توانا لگتے ہیں۔ وہ حالات کے نابینا غلام نہیں ہیں اور سماج اور تہذیب کے بلند رتبوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ شیخ حقیقت نگاری کے قائل ہیں اور اپنے کرداروں کے احساسات نفسیات اور ماحول سے خوب واقف ہیں۔"۲

۱) ماہنامہ دیش، سرینگر ۱۹۵۸ء، ص ۵۰۔

۲) دوراہا از عبدالغنی شیخ

عبدالغنی شیخ کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع ہے۔ ان میں پیار و محبت کی دھیمی دھیمی آنچ بھی ہے اور سماجی نابراری کا احساس بھی، ظلم و تشدد کے واقعات بھی ہیں اور وطن سے محبت بھی۔ بعض کہانیوں میں بھرپور طنز ملتا ہے۔ وہ سماج، سوسائٹی اور فرد پر کبھی کبھی طنز کے تیر بھی چلاتے ہیں۔ شیخ کے افسانوں میں ڈرامائیت بھی ملتی ہے۔ اس ضمن میں رشتے ناطے قاتل، دل ہی تو ہے، نہتے ہاتھ ''چھنگ (جو کی شراب) کے کئی جام چڑھانے کے بعد اس کا دماغ آسمان پر پہنچ گیا اور وہ اونچی اونچی آواز میں باتیں کرنے لگا۔ عورت بار بار اس کا ساغر بھرنے لگی۔ پندرہ پیالیاں لینے کے بعد جب عورت نے خالی جام بھرنے کیلئے دوبارہ صراحی اٹھائی تو اس نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ جیب سے بٹوا نکالا اور دس دس روپے کے دو نوٹ عورت کو دیئے۔ عورت نے تین روپے واپس کر دیئے جو اس نے احتیاط سے بٹوے میں رکھ لئے۔'' (مقابلہ، ص ۱۳-۱۴)

> ''حامد رُک رُک کر بولنے لگا لیکن نہیں جانتی میری، جہاں میں رہتا ہوں، وہ جگہ لیہہ سے بالکل بدتر ہے۔ لیہہ میں سیاحوں کی آمد کی وجہ سے بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ یہاں موجودہ زمانے کی ساری بنیادی سہولتیں میسر ہیں۔ لیکن میرے گاؤں میں ابھی کوئی سہولت نہیں کوئی ریستوران نہیں، کوئی ریڈنگ روم نہیں، یہاں تک کہ بجلی بھی نہیں۔ دھول گرد، ریت میرے گاؤں کے تحفے ہیں۔ گاؤں تک سڑک بھی نہیں جاتی چنانچہ سنگ ریزوں اور دھول سے اٹی ہوئی چار کلومیٹر لمبی ایک ڈھلوان پگڈنڈی پیدل طے کرنے کے بعد ہم اپنے گھر پہنچتے ہیں۔
>
> (آزمائش۔ ص ۳۷)

''نجمہ کی بانجھ ہونے کی بات ساس، سسر اور نندوں بھاوجوں کے بعد اب دادی اماں کی زبان پر اکثر آنے لگی تھی۔

نجمہ نے محسوس کیا کہ کچھ دن سے اس کے ساتھ گھر میں ایک سرد مہری سی برتی جارہی ہے۔ اس نے کئی مرتبہ نندوں اور بھاوجوں کو کانا پھوسی کرتے دیکھا جب وہ اُن کے پاس جاتی، وہ خاموش ہوجاتیں۔ پہلے پہل وہ ان کی رویہ پر پریشان ہوئی لیکن اب وہ بات سمجھ گئی تھی۔ ان سرگوشیوں کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ اس کی گود پچھلے چار سال سے خالی تھی۔ اس کے ساس سسر نے کئی مرتبہ اپنے بیٹے کے اولاد کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ شروع شروع میں ان کے لہجے میں نرمی اور ہمدردی ہوتی تھی، لیکن اب ان کے لہجے میں ملامت اور تہمت جھلکتی تھی۔'' (بانجھ۔ ص ۱۱۴)

عبدالغنی شیخ ایک معتبر ناول نگار بھی ہیں۔ ''وہ زمانہ'' ان کا لداخ کے ماحول اور اس کے تہذیب اور کلچر پر ایک تاریخی ناول ہے۔ ان کا دوسرا ناول 'دل ہی تو ہے' جو ۱۹۷۸ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو لداخ کی ایک دوشیزہ کے زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے لیکن پھر جب ان کی محبت کے درمیان میں ایک اور کردار آتا ہے تو یہ کہانی نیا رُخ اختیار کرتی ہے۔ شیخ کا ناول 'دِل ہی تو ہے' سونم اور پدما کی محبت کی داستان ہے۔ انہوں نے اس محبت کو خالص لداخ کے پس منظر میں پیش کیا ہے اور کامیابی سے زینہ بہ زینہ طے کر کے اس داستان کو ایک ایسے موڑ پر لایا جہاں خود بخود تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ دراصل سماج کا ٹکراؤ ہے۔ اس میں نیماں کا کردار داخل ہونے سے کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیہہ کے ماحول اور یورپی سیاحوں کے پس منظر میں لکھا ہوا یہ دلچسپ رومانی ناول ہے۔ عبدالغنی شیخ کی کہانیوں کا مجموعہ ''دو ملک، ایک کہانی'' اگست ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں ۴۵ کہانیاں ہیں۔ اس میں سنجیدہ کہانیاں بھی ہیں اور مزاحیہ کہانیاں بھی۔ ان کہانیوں میں

عام طور پر کشمیر کے مسائل کو اُبھارا گیا ہے۔ جو قابل مطالعہ ہیں۔

عبدالغنی شیخ ۔نے نہ صرف افسانہ نگاری اور ناول نگاری میں ہی اپنی طبیعت آزمائی ہے بلکہ انہوں نے بحیثیت ایک سوانح نویس کے بھی قابل قدر نام پیدا کیا ہے۔ان کی کتاب 'صنم فربو' بھی ایک اچھی کوشش ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ملک کے سرکردہ انجینئر، سفیر اور سیاستدان مرحوم صنم نربو کے کارناموں کو لوگوں کے سامنے رکھا ہے۔ جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیت سے سرینگر سے لیہہ جانے والی قومی شاہراہ تعمیر کر کے ایک شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔ اُن کے ادب ، ثقافت اور لداخی کلچر اور تاریخ پر متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں جو اپنی جگہ مسلم ہیں۔

☆☆☆

عبدالغنی شیخ کے افسانے ''ہوا'' کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری:

لداخ کی اپنی ایک شاندار تاریخ رہی ہے۔ چونکہ یہ خطہ صدیوں تک نہ صرف سنٹرل اشیا کا تجارتی مرکز رہا ہے بلکہ اس خطے نے سیاحتی' ثقافتی' سیاسی اور مذہبی معاملات وتعلقات میں بھی کلیدی رول ادا کیا ہے۔ پیش نظر افسانہ ''ہوا'' کا موضوع بھی بنیادی طور پر لداخ کی تہذیب وثقافت اور سیاسی وسماجی صورت حال کی عکاسی کررہا ہے' اس لئے یہ افسانہ تواریخی فکشن (Historical Fiction) کے زمرے میں آسکتا ہے۔ تواریخی فکشن لکھنے کے لئے تاریخی مطالعہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے یعنی فکشن نگار جس خطے یا علاقے کے تواریخی منظرنامے کو اپنی تخلیق میں پیش کرے تو اس منظرنامے کی آگہی کا وہ مناسب شعور رکھتا ہو۔ اس تناظر میں دیکھیں تو زیرنظر افسانے کا تخلیق کار عبدالغنی شیخ لداخی نہ صرف اسی خطہ کا پشتنی باشندہ ہے بلکہ وہ لداخ شناسی میں بھی ایک اہم مقام رکھتا ہے' کیونکہ ان کے تواریخی مضامین مثلاً 'لداخ کا جغرافیائی محل وقوع' 'لداخ ...غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں'' سیاچن گلیشر ...تاریخ کے آئینے میں'' وغیرہ کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ وہ لداخ کی تاریخ وثقافت کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور اسی تاریخی شعور کی فنی عکاسی ان کے بیشتر افسانوں مثلاً ''ایک فوٹو'' میں بھی صاف نظر آتی ہے۔

افسانہ ''ہوا'' میں ماضی کی ایک ایسی کرب ریز سماجی صورت حال کی تواریخی کہانی

بیان ہوئی ہے جو فسانہ سے زیادہ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ پہلے افسانے کے عنوان 'ہوا' پر ہی ارتکاز کریں تو یہ لفظ افسانے میں بطور علامت استعمال ہوا ہے اور پورے افسانے کی درد بھری کہانی کا علامتی حوالہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اس علامتی حوالے کے برتنے میں افسانہ نگار کا فنی کمال یہ ہے کہ پورا افسانہ پڑھنے کے بعد بھی یہ ایک علامت ہی رہتا ہے کیونکہ پوری کہانی میں ایک ایسا ابہام موجود ہے جو ظاہر ہونے کے باوجود بھی پوشیدہ ہی رہتا ہے اور کہیں پر بھی ہوا کی مخصوص شناخت ظاہر ہونے نہیں دیتا ہے بلکہ اشاروں کنایوں میں ہوا کے بنیادی محرکات کی طرف قاری کا دھیان پھیر دیتا ہے۔ افسانے کی شروعات مرکزی کردار کے درد بھرے جذبات سے ہوتی ہے جو ابتدا میں ہی قاری کی توجہ کھینچنے میں کارگر نظر آتی ہے:

"پہاڑ کا نصف حصہ چڑھنے کے بعد ہم ایک بڑے پتھر کے سامنے ستانے کے لئے رک گئے۔ پو پھٹ گئی اور لمحہ بہ لمحہ صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ میں نے اپنے گاؤں کی طرف نظر ڈالی۔"

افسانے کی ابتدا سے ہی ظاہر ہو رہا ہے کہ مرکزی کردار رات کے اندھیرے میں اپنے گھر یا گاؤں سے نکل کر پہاڑ کی جانب نکل پڑا ہے۔ لیکن ابھی یہ واضح نہیں ہو رہا ہے کہ یہ کیوں رات کے وقت گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہوا ہے۔ اس کے بعد جب وہ گاؤں کی طرف نظر ڈالتا ہے تو اسے گاؤں کے ہرے بھرے کھیت، اسکول، قلعے کا کھنڈر، مندر، اپنا گھر، ناند میں گھاس چر رہی اپنی گائے، گھوڑا وغیرہ سب نظروں کے سامنے آتے ہیں۔ ابھی تک وہ حیرت زدہ ہو کر صرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر آبائی قبرستان پر پڑتی ہے جہاں اس کے آبا و اجداد مدفون ہوتے ہیں اور یہی منظر نہ صرف افسانے کے بنیادی موضوع کی طرف اشارہ کرتا ہے بلکہ مرکزی کردار کے درد بھرے جذبات اور گاؤں چھوڑنے کے بنیادی مسئلے کو بھی اجاگر کر دیتا ہے:

''میری نظر پھسلتی ہوئی چھوٹے سے آبائی قبرستان پر پڑی جہاں میرے ابا اور اجداد مدفون تھے. میری آنکھوں میں آنسو آئے

'ابا' ہم آج تمہیں چھوڑ کر اس گاؤں سے جا رہے ہیں. اپنی خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری کے عالم میں. مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں آخری بار اپنے گاؤں کو دیکھ رہا ہوں. میں نے دل ہی دل میں اپنے گاؤں کو الوداع کہا.

میری بیوی اور بیٹی کی آنکھیں اشک بار تھیں. کچھ دیر ستا کر ہم دوبارہ چڑھنے لگے.'' اب افسانہ نگار نے ابہامی طور پر مرکزی کردار کی زبان سے گاؤں چھوڑنے کی مجبوری کا اشارہ دے دیا کہ یہ لوگ اقلیت سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ چھوٹے سے قبرستان سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ہی انہیں مخصوص ہوا کے دباؤ میں آکر گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا اور یہ صرف ایک ہی آدمی کی مجبوری نہیں بلکہ پورے پریوار کی مجبوری ہے کہ انہیں اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگنے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔

افسانے کی ابتدا میں تین کردار سامنے آتے ہیں یعنی مرکزی کردار (صدیق)' بیوی (خدیجہ) اور بیٹی (فاطمہ)۔ اس کے بعد کہانی کے دوسرے کرداروں کا سامنا ہوتا ہے جن میں سونم' ٹشی' دورجے اور چھینگ کے علاوہ زہریلی ہوا کو پھیلانے والے لوگ' جن کی شناخت یہ کہتے ہوئے پوشیدہ رکھی گئی ہے کہ ''یہ ہوا شہر سے آئی تھی'' شامل ہیں۔ افسانے میں مرکزی کردار کے علاوہ سونم بڑا متحرک کردار دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ افسانے کا پلاٹ اسی کردار کی بدولت بدلتا رہتا ہے اور کہانی کو کئی دلچسپ موڑ دینے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ جب مرکزی کردار اپنی فیملی سمیت بے بسی کے عالم میں پہاڑ کے نصف حصے میں بیٹھ کر ستانے لگتا ہے اور اپنی مجبوری کو یاد کرتا ہے تو اس مجبوری کا پردہ سونم کے کردار سے ہی کھل اٹھتا ہے۔ کیونکہ سونم ہی چند گھنٹے پہلے مرکزی

کردار کے گھر میں چھپ کر آیا تھا اور سہمے سہمے لہجے میں کہہ گیا تھا کہ:

''صدیق تمہارے لئے ایک بری خبر ہے۔''

سہمے سہمے ہم اس کا منہ تاکنے لگے۔

''تمہیں یہ گھر چھوڑ کر جانا پڑے گا۔''

''ابھے مذاق نہ کر۔'' میں نے اپنے عزیز دوست سونم سے کہا۔

''مذاق نہیں۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں.... ابھی.... اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔''

''کیوں؟'' میں چلا پڑا۔

''اس کیوں کا اس وقت میرے پاس جواب نہیں ہے صدیق۔''

یہ کہتے ہوئے آنسو کا ایک قطرہ اس کے رخسار پر ڈھلک آیا۔ میری بیوی اور بیٹی رونے لگیں۔''

اس مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سونم جو کہ صدیق کا دوست بھی ہوتا ہے خود بھی نہیں جانتا ہے کہ یہ ہوا کیوں صدیق کو ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے لیکن وہ دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے صرف یہ چاہتا ہے کہ صدیق اپنے آپ کے ساتھ ساتھ اپنے گھر والوں کی جان بھی بچائے۔ صدیق اس کی بات سن کر کوئی معقول وجہ جاننا چاہتا ہے کہ:

''آخر ہم سے کیا قصور سرزد ہوا ہے؟ کونسا ہم نے جرم کیا ہے؟''

لیکن سونم بے بسی کے عالم میں صرف اتنا ہی کہتا ہے کہ:

''قصور نہ تمہارا ہے اور نہ ہمارا۔ یہ ہوا شہر سے آئی ہے۔''

یہ سن کر مرکزی کردار حیرت زدہ ہو کر پوچھتا ہے کہ اسے کس نے بتایا تو سونم تھوڑی وضاحت کے ساتھ پوری بات بتا دیتا ہے:

''مجھے ٹشی نے کہا۔ ٹشی کو دورجے نے بتایا تھا۔ دورجے کو چھینگ نے اور چھینگ

.....ٹشی بتا رہا تھا کہ یہ بات تم کسی کو نہ بتاؤ' ورنہ یہ لوگ اس کے مکان کو جلا دیں گے۔''

''یہ لوگ...!''

''ہاں شہر سے آئے ہوئے یہی لوگ کہتے ہیں کہ تم اپنا مذہب یا گاؤں دونوں میں سے ایک چھوڑ دو۔صدیق ایسی ہوا انسان لاتا ہے۔''

یہاں پر سونم ایک معنی خیز جملہ بولتا ہے کہ ''ایسی ہوا انسان لاتا ہے''یعنی یہ کوئی قدرتی آفات نہیں ہے بلکہ انسان کی ہی پھیلائی ہوئی ایسی زہریلی ہوا ہے جو انسان کو انسان سے جدا کرنے یا مارنے پر مجبور کر دیتی ہے۔اور یہ ہوا فساد برپا کرنے والوں کی وہ زہریلی ہوا ہوتی ہے جس کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی وطن۔سونم کی پُراسرار باتیں سن کر مرکزی کردار حیران ہو جاتا ہے کہ:

> ''اچانک یہ کیسے ہوا۔گاؤں والے کل تک ہم پر بڑے مہربان تھے۔ہم تین پشتوں سے یہاں آباد ہیں۔تنگ کرنا تو درکنار' ہر ایک نے ہمیشہ ہمیں پیار و محبت دیا تھا اور ہمارے دکھ سکھ میں شریک ہوا تھا۔''

لیکن یہ سب سوچنے اور بحث و تکرار کے بعد آخر کار مرکزی کردار فیملی سمیت اپنا گھر بار چھوڑ کر پہاڑ کی جانب بھاگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔طلوع آفتاب کے ساتھ ساتھ جب یہ لوگ پہاڑ کی چوٹی کے نزدیک پہنچ جاتے ہیں تو پھر کہانی نیا موڑ لیتی ہے۔گاؤں سے نعرے بلند ہو جاتے ہیں اور چند جانے پہچانے چہروں کے علاوہ کئی انجانے لوگ مرکزی کردار کے مکان پر ہلہ بول دیتے ہیں۔جب انہیں مکان خالی نظر آتا ہے تو پھر لوٹ کھسوٹ کے ساتھ ہی مکان کو آگ لگائی جاتی ہے۔لیکن اس دوران مرکزی کردار اور اس کے گھر والے اپنے ہمسایوں اور دوستوں کو دیکھ کر اور زیادہ دکھی ہو جاتے ہیں کہ یہ لوگ بھی زہریلی ہوا کا ساتھ دینے لگے:

''دور جے!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ابا' وہ دیکھو.....جلوس میں سونم بھی ہے۔'' میری بیٹی چلا پڑی۔''

یہ نہیں ہو سکتا.....سونم کبھی نہیں آئے گا۔'' میں نے کہا.

''وہ دیکھو ابا.... جس نے جھنڈا اٹھایا ہے وہ سونم ہی تو ہے۔''

''سچ مچ' جھنڈا اٹھانے والا سونم تھا۔''

''وہ دیکھو ابا' چچا چھینگ اور ٹشی بھی جلوس میں ہیں۔'' میری بیٹی پھر چلائی۔

''آہستہ بولو فاطمہ۔'' میری بیوی نے سرزنش کی۔

اپنے جگری دوست چھینگ اور ٹشی کو دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔''

یہ خوفناک منظر دیکھ کر مرکزی کردار کے دل میں دوستی کے محبانہ رشتے کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے اور وہ سونم اور دوسرے دوستوں کی لوٹ کھسوٹ دیکھ کر جذباتی ہو کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا کل رات سونم نے ہمارے سامنے مگر مچھ کے آنسو بہائے تھے؟ کیا چھینگ' ٹشی اور دور جے نے مجھے گھر سے بے گھر بنانے کے لئے یہ سازش رچی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ دنیا کتنی بے وفا ہے اور دوست کیسے طوطا چشم ہیں۔ بقول شاعر:

باغباں نے آگ لگا دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

(ثاقب لکھنوی)

اس حشر سماں منظر کے بعد کہانی کا ڈسکورس بدل جاتا ہے۔ ابھی تک افسانے میں جس قسم کی اندوہ ناک صورتحال پیش ہوئی تھی اور انسانی رویوں کے بدلاؤ کا منفی پہلو سامنے آئے تھا وہ اچانک مثبت پہلو میں بدل جاتا ہے۔ کیونکہ دو ماہ بعد جب سونم شہر جا کر صدیق سے ملنے جاتا ہے تو فساد کے دوران اپنی اور دوسرے دوستوں کی عملی

کارکردگی کا احوال یوں سناتا ہے:

''صدیق، مجھے افسوس ہے۔ ہم تمہارا مکان اور سارا سامان بچا نہیں سکے۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ لوگ تمہارے مکان کو آگ نہ لگائیں، لیکن ہماری کوشش بے کار گئی۔ البتہ تمہارا گیس سیلنڈر اور چولھا میرے پاس ہے۔ تُشی کے پاس دیگ ہے۔ دورجے نے قالین بچائے ہیں۔ چھینگ نے تمہاری گائے پال رکھی ہے۔ اس رات، ہم چپکے سے تمہارے نیم جلے مکان دیکھنے گئے۔ کچھ برتن بھانڈے اور اناج کی دو بوریاں بچائیں جو ہم نے حفاظت سے رکھی ہیں۔ یہ سب ہمارے پاس تمہاری امانت ہیں۔..... ہم اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب تم گاؤں لوٹ کر آجاؤ۔ ہماری آنگموں اور دورجے کی بیوی ڈولماں کہتی ہیں کہ فاطمہ اور خدیجہ کے بغیر گاؤں سونا سونا لگتا ہے۔''

ابھی تک مرکزی کردار ہوا کے ساتھ ساتھ اپنے دوست احباب کے دل شکن رویوں سے دل شکستہ ہو کر نفرت انگیز کیفیت کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا لیکن وہ رویہ اب اچانک سونم کے ملنے اور اس کے انسانیت ساز کردار سے محبت آمیز کیفیت میں بدل جاتا ہے اور مرکزی کردار فساد کے قیامت خیز سانحہ کا دکھ بھول کر راحت کی سانس لیتے ہوئے کہتا ہے:

> '' بادِ نسیم تھی یا بادِ صبا، ایک لمبی مدت بعد میں نے ہوا کا ایک
> دلکش جھونکا محسوس کیا۔''

اس طرح سے افسانے کا اختتام سماجی ہم آہنگی (Social harmony) کے انسانیت پرور پیغام پر ہو جاتا ہے اور یہی خوبی اس افسانے کو جاندار کلائمکس دینے کا باعث بن جاتی ہے۔ افسانے میں فسادات کی زد پر آنے پر لوگوں کے ذہنی تناؤ اور فساد برپا کرنے والوں کے ذہنی جنون کی ہنرمندانہ عکاسی کی گئی ہے۔

افسانے کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں کہانی کو تہہ در تہہ پیش کیا گیا ہے اور منطقی انداز سے سارے واقعات پلاٹ میں سموئے گئے ہیں جس کی وجہ سے پلاٹ میں کہیں پر جھول نظر نہیں آتا ہے۔ ایک اور بات یہ بھی کہ افسانے میں مرکزی کردار کی جو درد بھری کیفیت پیش ہوئی ہے وہی کیفیت قاری پر بھی طاری رہتی ہے۔ بہرحال افسانے کا موضوعاتی برتاؤ اور فنی و اسلوبیاتی خوبیاں ضرور متاثر کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس افسانے کا ترجمہ کئی اور زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔

☆☆☆

عبدالغنی شیخ
قلم، قلمکار اور کتاب کی روشنی میں

سلیم انصاری جبل پور

قلم، قلمکار اور کتاب، عبدالغنی شیخ کا ایک طویل علمی مقالہ ہے جو ماہنامہ آج کل میں چار قسطوں میں شائع ہوا تھا اور جسے بعد میں ترمیم واضافے کے بعد کتابی شکل میں پیش کیا گیا۔ اس کتاب میں دنیا کے بہت سارے ادیبوں کی زندگی کے شب و روز کی مصروفیات، عادات و اطوار، لکھنے کا طریقہ، ان کی مشکلات، خوبیاں، خامیاں اور ان کے احوالِ زندگی کا دلچسپ مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ اس کتاب کا موضوع دلچسپ، منفرد اور اردو ادب کی حد تک عام ڈگر سے ہٹ کر ہے، لہٰذا اس کتاب کے لئے مصنف نے تقریباً ۳۵۔۴۰ برس تک رسائل و جرائد اور اخبارات سے خام مواد جمع کیا، نیز درجنوں انگریزی کتابوں کا عرق ریزی اور باریک بینی سے مطالعہ کر کے ان سے خاطر خواہ استفادہ کرنے کے بعد یہ کتاب مرتب کی ہے۔ یہ کتاب ماہنامہ آج کل نے مدیر کی ایما پر اپنے ادارہ پبلی کیشنز ڈویژن نے ۲۰۰۲ میں شائع کی ہے۔

عبدالغنی شیخ ایک سنجیدہ قلم کار ہیں اور طویل عرصہ سے ادب کی مختلف اصناف میں خامہ فرسائی کر رہے ہیں، ان کا تعلق سرزمینِ لداخ سے ہے اور ان کے مطابق لداخ کی تہذیب اور ثقافت کے مطالعے سے انہیں خاص شغف رہا ہے۔ قلم، قلمکار اور

کتاب دراصل ایک ایسا تکون یا مثلث ہے جس کے ایک سرے پر قلم، دوسرے پر قلمکار اور تیسرے سرے پر کتاب ہے اور یہ تینوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔قلم کے بغیر قلمکار کا تصور ناممکن ہے جب کہ قلم اور قلمکار کے بغیر کتاب وجود میں نہیں آسکتی۔موجودہ تیز رفتار سائبر اور کمپیوٹر عہد میں کتاب کی اہمیت اور افادیت کسی حد تک متاثر ضرور ہوئی ہے مگر یکسر ختم نہیں ہوئی ہے۔ریڈیو کے آنے پر اخبار ختم نہیں ہوئے، ٹی وی سے ریڈیو ختم نہیں ہوئے اور کمپیوٹر کے آنے کے بعد تو کتابوں کی اشاعت اور اس کی صنعت میں ایک انقلاب سا آگیا ہے۔اگر ہم غور کریں تو یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ موجودہ عہد میں کتاب کی اشاعت نسبتاً زیادہ آسان ہے ورنہ کتابیں جب ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں تو اس کے چند نسخے ہی وجود پزیر ہوتے تھے لیکن اس حوالے سے اب بہت ساری آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔اب محض چند دنوں میں ہی کسی بھی کتاب کے ہزاروں نسخے تیار کیے جاسکتے ہیں۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب ہر عہد میں نہ صرف انسان کی ضرورت رہی ہے بلکہ انسانی زندگی کا حصہ بھی رہی ہے۔کتاب کے بغیر انسانی تہذیب کے ارتقا کی موجودہ صورتِ حال یقیناً مختلف ہوتی۔تحریر اور کتاب نے اپنا سفر ایک ساتھ ہی شروع کیا، جب سے انسان نے لکھنا شروع کیا ہے تبھی سے وہ اپنی تحریر کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کا خواہش مند رہا ہے اور ظاہر ہے کتاب کے بغیر یہ ممکن نہیں ہوسکتا اور کتاب کے وجود میں آنے کا جواز بھی یہی ہے۔

عبدالغنی شیخ نے کتاب کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ابن جوزی نے اپنے قلم سے دو ہزار کتابوں کی کاپیاں نقل کی ہیں، حافظ ابن خراش بغدادی نے اپنے انتقال کے وقت کتابوں کے اٹھارہ صندوق چھوڑے جن میں زیادہ تر ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں، یحیٰ بن حسین نے اپنے ہاتھوں سے چھ لاکھ

احادیث نقل کیں، امام ابو اسامہ تادمِ حیات اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں قرآن پاک کے ۸۰ سے زیادہ نسخے لکھے۔ عبدالغنی شیخ نے یہ ساری معلومات برسوں بلکہ دہائیوں کی محنت اور عرق ریزی کے بعد حاصل کیں اور کتاب اور قلم کے صدیوں پر محیط سفر پر بہت کارآمد اور دلچسپ معلومات کو اردو کے عام قاری تک پہنچایا۔

عبدالغنی شیخ نے زیرِ تبصرہ کتاب میں قلمکار کی اہمیت کو واضح طور پر پیش کیا ہے اور یہ بات بالکل درست بھی ہے کیونکہ قلم کار کی عدم موجودگی میں کتاب وجود میں نہیں آسکتی۔ ان کے مطالعے کی روشنی میں یہ انکشافات ادب کے قارئین کی معلومات میں اضافے کا سبب ہیں کہ جنوبی افریقہ کے سرکردہ قلم کار اسٹوآرٹ کلوٹے نے قلم کار کو ہمہ جہت تسلیم کیا ہے۔ کلوٹے کے مطابق قلم کار کا مقصد حسن اور سچائی کی تلاش ہے اور یہی زندگی کی بنیاد ہے۔ ان کے مطابق قلم کار کا کام لکھنا اور مسلسل لکھنا ہے، مچھلی کے لئے جتنا پانی ضروری ہے اتنا ہی قلم کار کے لئے لکھنا ضروری ہے اور یہی بڑے قلمکاروں کی کامیابی کا راز ہے۔

عبدالغنی شیخ نے اس کتاب میں جو واقعات نقل کیے ہیں وہ دلچسپ تو ہیں ہی ان سے ہمارے نئے اور نوجون قلمکاروں کو ادب میں اپنی شناخت بنانے کی تحریک بھی ملتی ہے۔ اس حوالے سے کتاب کے مصنف نے ایک بڑا دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے کہ مغرب کے ایک نوجوان ادیب نے ایک بڑے ادیب کو خط لکھا کہ ''میں اپنی ادبی زندگی میں داخل ہورہا ہوں، کوئی نصیحت آپ مجھے دینے کی زحمت فرمائیں گے۔'' اس نوجوان نے یہ سوال بھی پوچھا کہ کیا لکھنے کے لئے کوئی واحد قاعدہ ہے؟ جس نے آپ کے لکھے ہوئے ہر لفظ کو مجسم صداقت کے طور پر سینے سے لگائے رکھا ہو۔ اس نوجوان نے یہ خط دوسو چھ ادیبوں کو لکھا اور سارے ادیبوں کے جوابات موصول ہوئے۔ برناڈ

شا نے اپنے ہاتھ سے دو صفحے کا جواب لکھا، کیپلنگ نے اپنے ہاتھ سے چار صفحے کا جواب لکھا، خط کے جوابات میں ایک نمایاں خط لیونارڈ میریک کا تھا جس نے نصیحت کے طور پر پورے صفحے پر یہی لکھا کہ لکھو، لکھو، لکھواور لکھو۔اس واقعے کی تفصیل سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایک اچھا قلم کار بننے کی کلید لکھنا اور صرف لکھنا ہے اور لکھے بغیر قلم کار کی حیثیت سے اپنی پہچان بنانا ناممکن ہے۔

مثلث کے تیسرے سرے پر کتاب ہے جس کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔مصنف کے مطابق قلم کار، ناشر اور کتب فروش کا بھی ایک مثلث بنتا ہے اور اگر اس میں قاری کو بھی شامل کرلیا جائے تو یہ مربع یا مستطیل بن جاتا ہے۔کتاب کی اشاعت سے پہلے ناشر اور بعد میں کتب فروش اور قاری کا وجود اس لئے ضروری ہے کہ اگر کتب فروش نہ ہوں تو قاری تک کتابوں کی ترسیل ممکن نہ ہوسکے گی اور پھر عام قاری تک قلم کار کی رسائی مشکل ہو جائے گی۔اس طرح ہم دیکھیں تو قلم کار، کتاب، ناشر، کتب فروش اور قاری سب ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن جاتے ہیں۔موجودہ عہد میں زندگی کے ہر شعبے میں سائنس، ٹیکنالوجی اور تمام تر علم و ادب کی ترسیل کے لئے کتاب ضروری ہے، کتابیں کبھی نہیں مرتیں کیونکہ یہ بار بار چھاپی جا سکتی ہیں۔کتابوں کے طفیل جہاں میں علم کا اجالا پھیلا، انسانی تہذیب نے ارتقا کی منزلیں طے کیں جس کے نتیجے میں لائبریریاں قائم ہوئیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں کچھ قدیم کتب خانوں کے تذکرے ملتے ہیں جن میں نالندہ، ٹیکسلا، وکرم شیلا کے کتب خانے اور اسپین میں اندلس اور قرطبہ کی لائبریریاں، مصر میں قاہرہ اور عراق میں بغداد کے کتب خانوں کی تاریخ ہماری قدیم تہذیب کا معتبر حوالہ تو ہیں ہی کتابوں کی اہمیت اور ان کے جواز کا ثبوت بھی ہیں۔

عبدالغنی شیخ کے مطابق کتب فروشی کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے، جس کے شواہد

ہمیں قدیم مصر میں ملتے ہیں۔ کتاب کے مصنف نے لکھا ہے کہ قدیم مصر میں شعرا اور ادبا اپنی کتابیں بیچنے کے لئے لوگوں کے سامنے اچھی باتیں بتاتے تھے اور لوگوں کو کتابیں خریدنے کے لئے راغب کرتے تھے۔اس کے علاوہ بھی قدیم دور میں کتب فروشی کے دوسرے طریقے رائج تھے۔کتاب اور اس کے مطالعے کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے عبدالغنی شیخ نے کئی ادیبوں کے اقوال بھی زیرِ تبصرہ کتاب میں نقل کئے ہیں۔مثال کے طور پر شیکسپیئر نے کہا کہ جس دن مجھے کتابوں سے الگ کر دیا جائے گا وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا، کارلائل کے مطابق اگر دنیا کی تمام سلطنتوں کے تاج میری کتابوں اور شوقِ مطالعہ کے بدلے میں میرے قدموں میں رکھ دیے جائیں تو میں انہیں ٹھکرا دوں گا۔مجھے یہاں یہ بات کہنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ کتابوں کا مطالعہ افراد کے ذہن و دل پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے جس کی نشاندہی فاضل مصنف نے بھی اپنی کتاب میں واضح انداز میں کی ہے اور جس کا اعتراف بہت سارے قلم کاروں نے کیا بھی ہے۔خواجہ احمد عباس نے تحریر کیا ہے کہ منشی پریم چند کی کتابوں سے میں نے سیکھا کہ ادب میں صرف رومان اور فرار نہیں ہوتا، انسانی زندگی کی سچی عکاسی ہوتی ہے۔مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کتابوں کے مطالعے کی خواہش یوں ظاہر کی کہ میرا بس چلے تو میں اپنی قبر میں کتابیں ہی کتابیں رکھوں تاکہ میں انہیں پڑھا کروں۔

عبدالغنی شیخ نے اس کتاب کی تصنیف میں بڑی عرق ریزی سے بہت کارآمد مواد جمع کر دیا ہے جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔انہوں نے دنیا کی بعض اہم کتابوں کی تصنیف کے محرکات اور ان میں نیند اور خواب کے عمل دخل کا بھی ذکر کیا ہے۔کئی اہم اور شاہکار تخلیقات کا رشتہ خواب سے رہا ہے، مثلاً کولرج کی مشہور نظم KUBLA KHAN کی تخلیق خواب میں ہوئی، تین گھنٹوں کی نیند کے دوران نظم کے دو سو سے

تین سو اشعار اس کے ذہن میں آئے جنہیں جاگنے کے بعد اس نے قلمبند کیے، ٹھکیرے کے مشہور ناول VANITY FAIR کا نام خواب میں سوجھا، مولانا جلال الدین رومی اور رابندر ناتھ ٹیگور کے کئی اشعار خواب میں تخلیق ہوئے جو بیدار ہونے کے بعد قلم بند کئے گئے۔

عبدالغنی شیخ نے اپنی کتاب میں کئی ایسے موضوعات پر معلومات فراہم کی ہیں جو اردو میں اس سے پہلے نایاب نہیں تو کمیاب ضرور تھیں انہوں نے زود نویس اور بسیار نویس قلمکار کے عنوان سے ایک علاحدہ باب قائم کیا ہے، اسی طرح قلم کاروں کے جسمانی نقص اور بیماری پر بھی کئی معلومات جمع کردی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ لکھنے میں عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی اسی طرح ذہانت کسی بھی عمر کے انسان میں ہو سکتی ہے ۔مثال کے طور پر ٹیگور نے سات برس کی عمر میں شاعری کی، کیٹس پچیس سال میں اور شیلے انتیس سال میں فوت ہوئے تب تک دونوں کی شاعری کا شہرہ انگریزی ادب میں دور دور تک پہنچ چکا تھا، وکٹر ہیوگو نے تیرہ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا اور چودہ سال کی عمر میں انہوں نے جو ڈرامہ لکھا اسے پڑھ کر سبھی حیران رہ گئے، فرانسیسی ناول نگار جارج سائیمین نے اپنا پہلا ناول سترہ برس کی عمر میں شائع کیا۔ اسی طرح گوئٹے نے FAUST کا آخری حصہ ۱۰۳ برس کی عمر میں مکمل کیا۔ شا نے اپنی کتاب FARFETCHED FABLES ۹۳ سال اور لیو ٹالسٹائی نے I CANNOT BE SILENT ۸۲ برس کی عمر میں لکھی۔ اسی طرح ہم دیکھیں تو دنیا کے بہت سارے نابغۂ روزگار ادیب جسمانی طور پر معذور ہونے کے باوجود لکھتے رہے اور ادب میں اعلیٰ مقام اور نام پیدا کیا۔ سقراط، موپاساں اور دوستووسکی کو مرگی کے دورے پڑتے تھے مگر ان کا یہ جسمانی اور ذہنی نقص ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکا۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کی ٹانگ بچپن میں فٹ بال کھیلتے

ہوئے ٹوٹ گئی اور وہ بارہ سال تک اپاہج رہا۔ کرسٹی براؤن ایک اپاہج تھا، وہ چلنے، کھڑے ہونے، بیٹھنے اور بولنے تک سے معذور تھا۔ ان سب کے باوجود اس نے بائیں پیر کی دو انگلیوں میں پینسل تھام کر اپنی آپ بیتی لکھی، انگریزی ادیب جارج تھامس فالج زدہ تھا وہ مشکل سے قلم سنبھال سکتا تھا اس کے باوجود وہ ایک کامیاب ادیب بنا۔ اس طرح کی اور بھی بہت ساری مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مضمون کی طوالت کے خوف سے اتنے پر ہی اکتفا کرتے ہوئے مجھے یہ کہنا ہے کہ لکھنے کے حوصلے اور جذبے نے قلمکاروں کو بیماریوں اور معذوریوں کے باوجود تخلیقی سفر پر گامزن رکھا یہی نہیں مالی دشواریوں، صعوبتوں اور غربت وافلاس کے باوجود اپنے لکھتے رہنے کے جنون کے سبب ادیبوں نے شاہکار تخلیق کیے ہیں اور یہ ایک بڑی بات ہے اور قابلِ تقلید بھی کہ بڑا ادیب وشاعر بننے کے لئے لکھتے رہنا ضروری ہے۔

عبدالغنی شیخ ہمارے عہد کے ایک ایسے قلم کار ہیں جن کی صلاحیتیں مختلف جہتوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور جنہوں نے لداخ میں بیٹھ کر بڑی محنت اور عرق ریزی سے یہ کتاب مرتب کی ہے جو اردو قارئین کے لئے یقیناً ایک نیا اور خوشگوار تجربہ ہے۔

☆☆☆

عبدالغنی شیخ

لداخ کی تاریخ اورادب کے آئینے میں

صغیر اشرف (اتراکھنڈ)

اردو ادب کی اصناف کے فروغ میں جن ہستیوں کی مقبولیت اور نا مقبولیت کے درمیاں جو لوگ اپنے ہم عصروں میں سربلند ہوئے اور جنہیں سب نے قبول کیا ان میں عبدالغنی شیخ ہمارے دور میں بہت نمایاں ہیں۔وہ اپنے تخلیقی فن پارے وفنّی اسلوب اور تکنیکی اعتبار سے قابلِ مطالعہ اور قابلِ ادب کی تخلیق کرنے والی معتبر شخصیت ہیں۔لیہہ لدّاخ سے تعلق رکھنے والے عبدالغنی شیخ صاحب کی علمی، ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور فنّی کارناموں کو منظرِ عام پر لانے کے لئے باضابطہ طور پر ریاستِ جموں اور کشمیر اکیڈمی آف کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر نے اپنے ادبی مجلّہ 'شیرازہ'، کی خصوصی اشاعت 'عبدالغنی شیخ نمبر' ترتیب دیا۔ شیخ صاحب کے تخلیقی ، تحقیقی جہات پر مبنی اس خصوصی اشاعت میں اہلِ قلم حضرات نے جہاں ان کے حوالے سے لدّاخ کی تہذیب و ثقافت پر خامہ پرسائی کی ہے وہیں شیخ صاحب کو ایک محقق اور ان کے اضاف ادب کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے ان کی فعالیت، ان کے طریقہ کار، ان کے حسیاتی اجمال، اور بیانیہ اظہار

کے نشانات اپنے مضامین میں ثبت کئے ہیں۔اور بطورِ تخلیق کار ان کو سمجھنے کی مجموعی کوشش کی ہے۔ان کی نگار شات کی مدد سے ان کے موضوعات، ان کے برتاؤ، ان کے پیغام سے ان کے ذہن کو خاکسار نے بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ان کے منطقی طرزِ تحریر کو محسوس کرکے ان کا قائل بھی ہوا ہے۔

عبدالغنی شیخ صاحب کے رشحاتِ قلم کی تحریر میں تصورِ کائنات ، تصورِ وقت، تصورِ مذہب ، تصورِ عشق ادب ، تصورِ سماج، انسانی رشتوں اور ان کے فہم و ادراک کی خاصہ فرمائی کی بات تو کی جاسکتی ہے مگر موضوع خاصہ پھیل جائیگا۔فی الحال یہاں میرا مقصد ان کی تحریر و تاثرات کا اظہار ہے جنہوں نے مجھے متوجّہ کیا اور میں نےمحسوس کیاکہ شیخ صاحب کاتخلیقی رویّہ ایک اخلاقی اور روحانی ادیب کا ہے جو واقعتاً مساوات میں یقین رکھتا ہے۔ان کے فکروفن کی جڑیں، ان کے وجدان ، روح اور ضمیر میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور نظامِ اخلاق پر روحانی رویّہ چھایا ہوا ہے جو قابلِ التفات ہے۔

میں عرصہ سے ان کے ادب و تحقیق اور تنقید و تواریخ کے پسِ منظر میں اردو کے موقّر جرائد میں ان کی تخلیقات پڑھتا آرہا ہوں۔ماہنامہ' آجکل' کے ستمبر ۲۰۱۲ء کے شمارے میں عبدالغنی شیخ صاحب کا مضمون' اسلامی جمہوریہ ایران کا سفر ' میرے مطالعہ میں آیا۔ اپنے مخصوص پیرائیہ اظہار اور تکنیک و اسلوب کے اعتبار سے لائق صدتحسین اس مضمون پر اپنی پسندیدگی کی ہر ثبت کرتے ہوئے انھیں مبارکباد کا خط تحریر کیا۔جس میں میری جذباتی خود آگاہی اور

حسّاس طبعی کچھ اس طرح جھلکتی ہے۔

محترم۔سلام ورحمت مزاجِ گرامی۔!

".......ستمبر ۲۰۱۲ء کا شمارہ ماہنامہ' آجکل ' بدستِ خاص ڈاکٹر ابرار رحمانی ایڈیٹر ' آجکل ' نظر نواز ہوا۔جس میں اسلامی کلچر بالخصوص امام خمینی پر ترتیب وتحریر کیا ہوا یہ مضمون نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ سپردِ قلم کیا گیا ہے۔اور اپنے بطن میں اسلامی جمہوریۂ ایران کی سماجیات و سیاست، وہاں کے کلچر ، وہاں کے شرعی علماء کے فریضے اور مزید معلومات فراہم کرکے آپ نے بذریعہ ماہنامہ' آجکل ' انڈین سامعین کی نذر کیئے۔..بے حد پسند آیا۔مبارکباد پیش کرتا ہوں۔،

مزید یہ کہ لدّاخ میں اردو شعروادب کن منزلوں میں ہے...۱۹۴۶ء کے بعد' تاشی ربگیاس ، نے لدّاخ میں علم و ادب کی شمع روشن کی تھی لیہہ میں غالباً ان کا قیام تھا، اردو ادب (شعرونظم) میں ان کی کیا خدمات رہیں، ان کی تصنیفات اورنظم و غزل کے چندشعرو بند...، اردو ادب میں کوئی کارنامہ...؟؟ اور یہ کہ تاشی حیات ہیں..۔؟؟؟ مختصراً تحریرکریں توعنایت ہوگی۔۔!!

(مطبوعہ ماہنامہ ' شیرازہ ، عبدالغنی شیخ نمبر ، جولائی تا اکتوبر ۲۰۱۸ء (صفحہ ۷۸۔۲۷۷) (درج ذیل خط میں تاشی ربگیاس کے تعلق سے غرض کروں کہ دو ماہی اردو ' شیرازہ ، (اب ماہنامہ) کے سال ۱۹۷۲ء کے کسی شمارے میں تاشی کا مضمون ' نیا لدّاخی ادب ، (مطلوبہ شمارہ صفحہ ۱۸۱) شائع ہوا تھا۔جس کے پس منظر میں میں نے ایک مضمون تحریر کیا تھا... مذید معلومات کے لئے عبدالغنی شیخ

صاحب کو لکھے خط میں یہ تذکرہ کیا...) اور یہ رہا برجوابِ آں خط.... جو میری تحقیقی و تنقیدی بصیرت پر مبنی کتاب ' آئینہ در آئینہ ' کے صفحہ ۶۸-۲۶۷ پہ شائع ہوا---- لکھتے ہیں۔

۳ مئی ۲۰۱۳ سنہ محترمی، السلام علیکم !

آپکا مراسلہ موصول ہوا۔ شکریہ !!

میں کئی ماہ بعد سرینگر سے لوٹا ہوں اس لئے جواب دینے میں تاخیر ہوئی۔ معذرت خواہ ہوں۔ میں سردیاں سرینگر میں گذارتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپکو 'جمہوریہ اسلامیہ ایران کا سفرنامہ' مطبوعہ آجکل، پسند آیا۔ ' ٹشی ربگیاس، (مطبوعہ شیرازہ، نیا لدّاخی ادب، میں تاشی ربگیاس نام تحریر ہے) صاحب کے بارے میں آپ نے دریافت کیا ہے... وہ حیات ہیں۔ کافی عمر رسیدہ ہیں ۔ لکھنے پڑھنے کا کام اب ان سے نہیں ہوتا ہے۔ انہوں نے لدّاخی میں لکھا ہے، انہیں اردو آتی ہے شاید ایک آدھ مضمون اردو میں لکھا ہو۔ انھوں نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے۔ میں اردو میں لکھتا ہوں۔ ' آجکل' کے علاوہ 'ایوانِ اردو' میں میری کہانی اور مضامین چھپے ہیں۔ نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا نے میری کتاب 'لدّاخ : محققوں اور سیاحوں کی نظر میں' چھاپی ہے۔ آپ کی غزلوں کی کتاب 'حرفِ سخن ' ملی ہے ۔ ساری غزلیں اچھی لگیں کچھ اشعار تو براہِ راست دل پر اثر کرتے ہیں ۔ پچھلے دنوں ' ایوانِ اردو ' میں شاید آپ کی تحریر نظر سے گذری ۔ آپ کی نثر نگاری بھی ماشاء اللہ خوب ہے۔ !

آپ کا خیراندیش

☆☆☆

عبدالغنی شیخ کے غیر ادبی کارنامے

محمد الیاس کرگلی (دہلی)

لداخ میں اردو ناول کے میرِ کارواں عبدالغنی شیخ ہیں۔ آپ 05 مارچ 1936 ء
لیہہ میں پیدا ہوئے۔ شیخ صاحب کے ایک حالیہ بیان کے مطابق تادم تحریر
حقیقت ان کی عمر نوے سال سے تجاوز کرتی ہے ان کے دادا انیسویں صدی کے
دوسرے نصف میں کشمیر سے لداخ آئے تھے اور لیہہ میں ہی مریم نامی ایک خاتون
سے شادی کی۔ ان کے والد ابھی چھ سال کے تھے کہ دادا کا انتقال ہو گیا اور گھر کی
ساری ذمہ داری ان کے والد پر آن پڑی۔ ابتدائی تعلیم لیہہ کے ہی مڈل اسکول سے
حاصل کی۔ ان دنوں لیہہ میں یہی واحد اسکول تھا۔ جسے بعد میں نویں اور پھر دسویں
جماعت کا درجہ دیا گیا تو آپ نے وہیں سے 1951 میں دسویں جماعت کا امتحان بھی
پاس کیا۔ دسویں کے بعد آپ ویٹرنری اسٹاک اسسٹنٹ کی ٹریننگ کے لئے سری نگر
آئے۔ سری نگر میں انھوں نے پرائیویٹ طور پر گریجویشن کرنے کا ارادہ کیا، کیوں کہ
انھیں اردو میں ادیب فاضل کرنے میں دلچسپی تھی۔ لیہہ واپس لوٹنے کے بعد لیہہ
ویٹرنری اسپتال میں ہی آپ بطور انچارج ڈاکٹر تعینات ہو گئے۔ 1957 میں آپ
سری نگر گئے اور ادیب فاضل کا امتحان دیا اور سکینڈ ڈویژن میں پاس ہو گئے۔ ویٹرنری
میں ملازمت آپ کو پسند نہیں آئی لہٰذا سری نگر جا کر اس ملازمت سے استعفیٰ منظور کر
والی اور اسی دوران ایف۔ اے کا امتحان بھی پاس کیا۔ 1958 میں لوئر ہائر اسکنڈری

اسکول تینگ موگانگ میں بطور ہیڈ ماسٹر آپ کا تقرر ہوا۔ 1960 میں بی اے آنرز کیا۔ 1963 میں مرکزی سرکار کے شعبۂ اطلاعات میں فیلڈ پبلسٹی آفیسر کے طور پر تعینات ہوئے۔ یہ چونکہ آپکا پسندیدہ محکمہ تھا اور ساتھ میں آپ کو لداخ کی ہر جگہ جانے کا موقع میسر آیا۔ 1970 میں جموں میں پریس انفارمیشن بیورو میں بطور انفارمیشن اسسٹنٹ جوائن کیا۔ جموں سے کچھ عرصے بعد سری نگر تبادلہ ہوا۔ یہاں سے گیارہ سال بعد 1981 میں لیہہ ریڈیو اسٹیشن منتقل ہوئے۔ وہیں 1988 میں پھر سے سری نگر بطور نیوز ایڈیٹر (ڈپٹی ڈائریکٹر نیوز) تبدیل ہوئے۔ آگے چل کر 1991 میں انھوں نے دہلی میں آکاشوانی کے جنرل نیوز روم جوائن کیا۔ آخر میں 1992 میں آپ نے ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لی اور واپس لیہہ آکر اسلامیہ پبلک ہائی اسکول میں بطور پرنسپل جوائن کیا۔ اس کے بعد آپ لیہہ میں مختلف تنظیموں سے جڑے رہے اور تصنیف و تالیف کا کام بھی انجام دیتے رہے۔

لداخ میں اردو کے حوالے سے سب سے اہم نام عبدالغنی شیخ کا ہے۔ آپ بہ یک وقت افسانہ نگار، محقق اور مورخ ہیں۔ ان کی اب تک اردو میں پندرہ کتابیں شائع ہوئی ہیں، جن میں ناول، افسانوی مجموعے، سوانح عمری، تاریخی و تحقیقی کتابیں اور سفرنامے شامل ہیں۔ لکھنے کا سلسلہ آغاز جوانی سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ سن 1969 میں مہاتما گاندھی کی حیات اور تعلیمات پر ایک کتابچہ کا مسودہ تیار کیا، جسے کلچرل اکادمی کی طرف سے پہلا انعام ملا۔ وہیں سے یہ سلسلہ تاعمر جاری رہا۔ ابتدا میں کئی ادبی کتابیں تصنیف کیں اور پھر اس کے بعد تاریخی و تحقیقی کتابیں لکھنا شروع کیں۔ پہلی کتاب جو غیر ادبی ہے وہ سن 1977 میں ''وہ زمانہ'' کے نام سے شائع ہوئی، جس پہ ناول لکھا ہے اور اب تک لداخ کی اردو پر اردو میں لکھنے والوں او محققین نے بھی اسے سرسری طور پر ناول ہی کے طور پر پیش کیا ہے لیکن یہ اردو ناول کے

معیار پر کھرا نہیں اترتا ہے، کیونکہ نہ اس میں کوئی کہانی ہے، نہ پلاٹ اور سب سے اہم اس میں موجود سارے کردار حقیقی ہیں۔ اس میں پرانے زمانے کے لداخ کے روزمرہ واقعات بیان ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس کو ناول کہنا مناسب نہ ہوگا۔ البتہ اس کتاب میں پرانے زمانے کے لداخ کی روزمرہ زندگی، لوگوں کے رہن سہن، طور طریقے اور لداخ میں آنے والی نئی ٹیکنالوجی کا ذکر ہوا ہے۔

انھوں نے لداخ کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت پر گراں قدر کام انجام دیے ہیں۔ محکمہ اطلاعات سے جڑے رہے اور ریڈیو کی وساطت سے پروگرام پیش کرتے رہے۔ سن 1973 سے سرینگر میں ریسرچ لائبریری میں لداخ پر ریسرچ کرنا شروع کیا اور 1979 میں بچوں کے بین الاقوامی سال پر بچوں کے لئے دو کتابیں ''لداخ کی سیر'' اور ''کتابوں کی دنیا'' کے مسودے تیار کئے جن پر انھیں ریاستی حکومت کی طرف سے انعام بھی ملا۔ سن 1983 میں ''لداخ کی کہانی'' کے عنوان سے ریڈیو کشمیر لیہہ سے ایک پروگرام کا سلسلہ شروع کیا۔ انٹرنیشنل ایسوسیشن فار لداخ اسٹڈیس سے بھی منسلک رہے اور اس تنظیم کے سیمناروں میں شرکت کے لئے دنیا کے مختلف ممالک میں سفر کا بھی موقع ملا۔

صنم نربو لداخ کا ایک معروف انجینئر گزرا ہے۔ عبدالغنی شیخ نے ان کی سوانح عمری ''صنم نربو'' کے ہی نام سے 1981 میں لکھی ہے۔ صونم نربو کی پیدائش 28 جولائی 1909 کو لیہہ کے پاس سکراہ محلّہ میں ہوئی۔ اس زمانے میں لداخ میں شخصی حکومت عروج پر تھی۔ عبدالغنی شیخ نے صنم نربو کی زندگی کے احوال کو مختلف عنوانات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے صنم نربو کی زندگی کا خاکہ کھینچا ہے اور اس سوانح عمری کی غرض و غایت کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ اگلے حصے میں ان کی پیدائش اور اس وقت کے لداخ پر خامہ فرسائی کی ہے۔ پھر ابتدائی تعلیم اور اس کے بعد صنم نربو

کے سری نگر جانے کے احوال کو پیش کیا ہے۔دوسرے عنوانات کے نام صنم زبو انگلینڈ میں، شادی، لیہہ ہوائی اڈا کی تعمیر، ، لیہہ سری نگر سڑک تعمیر، ڈیولوپمنٹ کمیشنر، سیاست، سفیر، وزارت، معمولات اور عادات، مطالعہ، اعتقادات، صنم زبو بحیثیت انسان، صنم زبو ایک ڈپلومیٹ اور سیاستدان کی حیثیت سے، ایک انجینئر کی حیثیت سے، جدید لداخ کے ایک معمار کی حیثیت سے اور آخری سفر وغیرہ ہیں۔

شیخ کے ہاں لداخ کی تاریخ اور تہذیب وثقافت کے علاوہ بھی کتابیں ملتی ہیں، جن میں ''قلم قلمکار اور کتاب'' اور ''اسلام اور سائنس'' شامل ہیں۔ ''قلم، قلمکار اور کتاب'' پر سن 2000 میں کام شروع کیا اور اسی سال دسمبر میں ''آج کل'' دہلی میں اس کی پہلی قسط شائع ہوئی۔ اس کے بعد متواتر مزید چار قسطیں بھی شائع ہوئیں۔ محبوب الرحمٰن فاروقی نے شیخ کو خط لکھا اور اسے کتابی شکل دینے کی پیش کش کی۔ شیخ نے اس پیش کش کو قبول کیا اور یوں سن 2002 میں یہ کتابی شکل میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کو لکھنے میں شیخ صاحب نے اپنے ایک پرانے غیر مطبوعہ مسودہ ''کتابوں کی دنیا'' کے علاوہ دو انگریزی کتابیں Writer's Craft اور Author!Author سے استفادہ کیا ہے۔ان کتابوں کے علاوہ بھی مصنف نے دنیا کی متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔اردو اور انگریزی کے بہت سارے مصنفین کے حوالے بھی شامل کتاب ہیں۔قلم، قلمکار اور کتاب کو دراصل مصنف نے ایک مثلث یا تکون عبارت کے طور پر لکھا ہے جس میں قلم کی افادیت، قلمکار کی دنیا شناسی اور کتابوں کی اہمیت کو دلائل کے ساتھ خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کتاب کے لکھنے میں بہت ساری کتابوں کی ورق گردانی کی ہے۔

''اسلام اور سائنس'' ان کی ایک اور تحقیقی کتاب ہے، جو 2009 میں چھپی ہے۔

یہ کتاب سائنس کی ایجادات میں اسلام کے رول کا جامع احاطہ کرتی ہے۔اس میں
قرآن مجید کی آیات کے ساتھ ساتھ سائنسی کتب کے اقتباسات اور حوالہ جات بھی
دیے گئے ہیں۔انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سائنسی علوم کی ترقی اور
فروغ میں اسلامی تعلیمات اور مسلمان سائنس دانوں کا رول بہت ہی اہم ہے۔جو
ایجادات آج مغربی سائنس دانوں نے کی ہیں،ان کی نشاندہی آج سے برسوں سال پہلے
مسلمان سائنس دانوں نے کررکھی ہے۔علاوہ ازیں اس کتاب میں سائنس کے مختلف علوم
جیسے علم طب،علم ریاضی،علم معدنیات،اسلام اور ماحولیات وغیرہ پر بحث کی ہے۔

عبدالغنی شیخ نے لداخ پر کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔یوں تو انھوں نے
اپنے آغازِ سفر کے ساتھ ہی لداخ پر مضامین لکھنا شروع کیا تھا،لیکن سب سے پہلے
ایک ضخیم کتاب ''لداخ،تہذیب وثقافت'' کے نام سے 2005 میں منظر عام پر آئی
جس میں انھوں نے لداخ کی تاریخ،تہذیب وثقافت،رسم ورواج،مختلف مقامات
مختلف مذاہب،علم وادب،چرند وپرند،لداخ میں مہم جوئی،لداخی شخصیات اور لداخی
دیہات کا ذکر کیا ہے۔ان عنوانات کے علاوہ ''لداخ میں اردو'' پر بھی ایک مختصر باب
شامل کتاب ہے۔پیش لفظ میں کتاب کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں۔

''لداخ تہذیب وثقافت' اردو میں لداخ پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے،جو
میرے پینتالیس سال کی تحقیق اور ریاضت کا ثمرہ ہے،اس میں لداخ کی تاریخ
ثقافت،تمدن،یادگاروں،اہم مقامات،مذاہب،شخصیات،لوک ادب،زبان،جنگلی
جانوروں وغیرہ پر مختلف مضامین میں بصیرت افروز روشنی ڈالی گئی ہے۔ان میں
انگریزی اور اردو کے مختلف رسائل وغیرہ میں بھی میرے مطبوعہ مضامین شامل ہیں
جن میں نئی تحقیق اور ردوبدل کے ساتھ نئے مواد کا اضافہ کیا گیا ہے۔انہیں لکھنے میں
ذاتی مشاہدات،تجربات،مختلف جانکار افراد سے انٹرویو لینے کے علاوہ متعدد کتابوں

مضامین، نیشنل آرکائیوز اور جموں وکشمیر آرکائیوز (محافظ خانوں) کے ریکارڈ سے استفادہ کیا گیا ہے۔"

(لداخ، تہذیب و ثقافت ۔۔ عبدالغنی شیخ ۔۔ پیش لفظ۔ صفحہ نمبر 11 ۔ دوسرا ایڈیشن 2012)

مصنف نے اقتباس میں لداخ پر اردو میں اسے اپنی نوعیت پہلی کتاب ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے جو کہ ایک زاویہ سے درست نہیں ہے۔ کیونکہ اسے قبل کاچو سکندر خان نے 1987 میں ایک مبسوط کتاب اردو میں "قدیم لداخ۔ تاریخ وتمدن" کے نام سے لکھی ہے۔ البتہ "قدیم لداخ" میں لداخ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ تہذیب وتمدن پر ہی زیادہ زور دیا گیا ہے اور عبدالغنی شیخ کی کتاب "لداخ۔ تہذیب و ثقافت" میں لداخ کے دیگر شعبہ ہائے زندگی کا ذکر بھی ہوا ہے۔

عبدالغنی شیخ نے اردو کے دیگر نثری اصناف کے ساتھ سفرنامے بھی لکھے ہیں، جو کتابی شکل میں موجود نہیں ہے، ان کے سفرنامے جموں وکشمیر کلچرل اکادمی سری نگر کی جانب سے چھپنے والا جریدہ "شیرازہ" کے اسپیشل ایڈیشن "عبدالغنی شیخ نمبر" میں شائع ہوئے ہیں۔ 650 صفحات پر مشتمل یہ ایڈیشن خصوصی طور سے انھیں کے نام ہے۔ شیخ کے مطابق انہوں نے ایک درجن سے زائد ملکوں کے سفر کیے ہیں، جن میں آٹھ مما لک یورپ، چار ایشیا اور ایک لاطینی امریکہ سے ہیں۔ "عبدالغنی شیخ نمبر" میں ان کے دو مختصر سفرنامے شامل ہیں جن کے عنوان "سفرنامۂ روم واستنبول" اور "سفرنامۂ انگلستان اور برازیل" ہیں۔ شیخ کو دنیا کے مختلف مشہور شہروں کو دیکھنے کا موقع ملا جن میں لندن، پیرس، روم، ریوڑی جزو، زوریک ہائیڈل برگ، اسلام آباد، سنگاپور، کوپن ہیگن، مشہد مقدس اور کونسٹنز شامل ہیں۔ سفر کے بارے میں اور اپنے ذوق کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

''بہت سارے لوگوں کی طرح مجھے بھی سیاحت کا بڑا شوق ہے۔ میں نے بچپن سے ہی خوبصورت مقامات دیکھنے کے خواب دیکھے ہیں۔ کچھ اِن میں پورے ہوئے چند تادمِ تحریر پورے نہیں ہوئے۔ ایک خواب ریوڈی جزو دیکھنے کا تھا۔ برازیل کے اس خوبصورت شہر کے بارے میں، میں نے کہیں پڑھا تھا۔ برسوں بعد اتفاقی طور پر یہ خواب پورا ہوا۔ میں نے لندن میں برٹش میوزم، کوپن ہیگن میں گول گنبد، (جو درسی کتاب میں تھا) روم میں ویٹیکن، دیوارِ چین اور اہرام مصر دیکھنے اور پیرس میں ایفل ٹاور پر چڑھنے کے خواب دیکھے تھے۔ جس نوٹ بک پر یہ تمنائیں لکھی تھیں، وہ تلاشنے پر ہاتھ نہیں آیا۔''

(شیرازہ، عبدالغنی شیخ نمبر، صفحہ نمبر 404، شمارہ: ۱۰۔۷، 2018)

عبدالغنی شیخ کے سفرنامے گرچہ مختصر ہے لیکن ان میں انہوں نے اپنے سفر کے تجربات اور روداد کو سلسلہ وار طریقہ سے بیان کیا ہے۔ ان کے سفرناموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ سفر کے حالات و واقعات کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مذکورہ علاقوں کی تاریخ اور دیگر علمی و تحقیقی باتیں بھی پیش کرتے ہیں۔ سفرنامے چونکہ طویل نہیں ہیں، اس لئے انہوں نے مخصوص اور ان سنے واقعات کو ہی قلمبند کیا ہے، جس سے قارئین میں ایک دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور یہی تاثر آخر تک قائم رہتا ہے۔ دیگر نثری اصناف کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس غیر افسانوی صنف میں بھی ہاتھ آزمایا ہے۔

لداخ پر ان کی دوسری تصنیف 2011 میں ''لداخ محققوں اور سیاحوں کی نظر میں'' منظر عام پر آئی۔ دراصل 2005 میں ہی ایک مضمون ''لداخ سیاحوں کی نظر میں'' کے عنوان سے ریاستی کلچرل اکادمی کے رسالہ ''شیرازہ'' کے خصوصی شمارے میں چھپا

تھا، جو 110 صفحات پر مشتمل تھا۔ مذکورہ بالا کتاب میں صدیوں سے زمانہ حال تک لداخ میں آنے والے 222 سے زائد سیاحوں، اسکالروں اور محققوں کے تاثرات پیش کیے گئے ہیں۔ خود مصنف کے مطابق اس کتاب میں لداخ آنے والے سیاحوں اور محققوں کے علاوہ بھی یہاں نہ آنے والے متعدد محققوں کے بیانات بھی شامل ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے لگ بھگ 175 سے زائد کتابوں اور ماخذات سے استفادہ کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں لداخ سے متعلق کچھ دوسری معلومات بھی درج ہیں لیکن مصنف کی نگاہ صرف لداخ کے ایک ہی ضلع یعنی لیہہ کے ارد گرد گھومتی ہے، اس سے کہیں کہیں حقائق کے بیان میں تشنگی سی معلوم ہوتی ہے۔

عبدالغنی شیخ نے لداخ پر مختلف مضامین لکھے ہیں جو ملک و دنیا کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ انٹرنیشنل ایسوسیشن فار لداخ اسٹڈیز IALS کے مختلف سیمیناروں میں دنیا کے کئی ممالک میں مقالہ پڑھا ہے۔ لداخ پر ان کی ایک اور اہم کتاب ''لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے'' کے نام سے 2017 میں منظر عام پر آئی۔ اس میں شامل اکثر مضامین ریاستی کلچرل اکادمی کے جریدے ''شیرازہ'' کے خصوصی شماروں میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کتاب کے کچھ اہم مضامین 'لداخ کا جغرافیائی محل وقوع۔۔ اس کے مثبت اثرات اور منفی اثرات اور چین سے سرحدی تنازعہ'، 'ہند چین سرحدی تنازعہ نئے دور میں'، 'سیاچن گلیشر۔۔گل گلاب کا گلستان یا بلند ترین محاذ جنگ'، 'برصغیر ہند میں حضرت عیسیٰؑ کی آمد'، 'لداخ کے ہمس گنپہ کا پراسرار صحیفہ' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ لداخ کی تاریخ پر اب تک کئی مورخین نے کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے بنیادی ماخذ ''لداخ رگیالربس''، یعنی شاہنامہ لداخ کو مانا جاتا ہے، لیکن دیگر مورخین کے مطابق لداخ گیالربس خامیوں سے مبرا نہیں ہے۔ اس بات کی طرف الیکزنڈر کننگھم نے بھی اشارہ کیا ہے۔ شیخ صاحب نے بھی زیر نظر کتاب میں 'لداخس

رگیالربس' کی بعض خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔اس کے علاوہ کتاب میں ایک اہم موضوع حضرت عیسیٰؑ کی آمد لداخ ہے۔جس میں سب سے پہلے 1892 میں روس کے ایک صحافی نکولس نوٹووچ نے The Unknown Life Of Christ کے نام سے ایک کتاب لکھی اور یہ دعویٰ کیا کہ انھوں نے اپنے سفر کے دوران لداخ کے ہمس گونپہ میں ایک قدیم نسخہ دیکھا جس میں لکھا تھا کہ حضرت عیسی اپنی حیات کے نامعلوم سالوں کے دوران ہندوستان اور اس کے پڑوس ملکوں میں تھے۔ان کی آمد لداخ پر دنیا میں بحث و تمحیص ہو چکی ہے۔شیخ صاحب نے ان تمام دلائل اوران پر ردِ عمل کو مذکورہ باب میں شامل کیا ہے۔مزید اس کتاب میں ہند چین سرحدی تنازعہ کو تاریخی قضیہ کی روشنی میں پیش کیا ہے۔جس میں مصنف نے مختلف مورخین اور ماہرین سیاست کا حوالہ پیش کر کے بات کو مستند بنانے کی کوشش کی ہے۔

حواشی

پریم ناتھ پردیسی۔عہد،شخص اورفن کار،مرتبہ ڈاکٹر پریمی رومانی صفحہ نمبر 82 سنہ اشاعت 2009

شیرازہ۔عبدالغنی شیخ نمبر۔ہمالیائی بلندیوں کی منفرد آواز۔۔عبدالغنی شیخ۔دوملک ایک کہانی کے آئینہ میں۔دیپک بدکی۔

☆☆☆

سفر نامہ

اسلامی جمہوریہ ایران کا سفر

عبدالغنی شیخ

اسلامی جمہوریہ ایران ہر سال امام خمینی کی برسی بڑی عقیدت، احترام اور جوش وخروش سے مناتا ہے۔ اس ضمن میں مئی کے اختتام اور جون کے اوائل میں ایک ہفتہ کے دوران مختلف تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ اس موقع پر بیرون ملک سے مندوبین مدعو کئے جاتے ہیں۔ ۲۰۱۲ء میں ایران کلچرل ہاؤس دہلی کی دعوت پر مجھے امام خمینیؒ کی ۳۲رویں برسی میں شرکت کا موقع ملا۔

دو تین سال پہلے ایک انگریز خاتون فرانچیسکا میریٹ نے ایران میں اپنی سیاحت کا ذکر کرتے ہوئے مجھے کہا۔ ''مجھے ایران کے لوگ بڑے متمول لگے۔'' ہم دونوں دو دہائیوں سے ایک تنظیم انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار لداخ اسٹڈیز سے وابستہ تھے۔ میں نے فرانچیسکا سے ایران کی اپنی سیاحت کی خواہش کا اظہار کیا۔

ایران کلچرل ہاؤس کی ہدایت پر جعفر علی خاں اور میں نے ۲۵رمئی کو دہلی پرواز کیا۔ جعفر علی خان کرگل کے ڈگری کالج میں سماجیات پڑھاتے ہیں۔ اسی صبح ہم نے ایران کلچرل ہاؤس کو ہمارے ویزا وغیرہ کے لوازمات مکمل کرنے کے لئے اپنے پاسپورٹ دئے۔ کلچرل ہاؤس کے ایک اہلکار نے ہمیں ۲۹رمئی کی صبح کلچرل ہاؤس آنے کے لئے کہا۔ اسی دن ہماری ایران روانگی کا پروگرام تھا۔

۲۹رمئی کی صبح ہندوستان سے ایران جانے والے ۴۵رمندوبین ایران کلچرل

ہاؤس پہنچے۔ان میں چند خواتین بھی تھیں۔ ایران کلچرل ہاؤس نئی دہلی کے کارگزار کلچرل کونسلر احمد عالمی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس سفر کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے امام خمینیؒ کی حیات وخدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ امام تاریخ ساز شخصیت تھے۔جنہوں نے ایران میں انقلاب لایا اور بادشاہت ختم کی۔ امام تادم حیات کرائے کے ایک معمولی مکان میں رہے۔جو مہمان حضرات تہران میں ملے۔انہوں نے کہا کہ امام کی برسی پر تہران میں لاکھوں لوگ جمع ہوتے ہیں۔شاہ کے دور حکومت میں امام کے قید و بند کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ایک مرتبہ جب امام کو قم سے تہران لایا جارہا تھا تو فجر کی نماز کا وقت آیا تو امام نے نماز ادا کرنے کے لئے رکنا چاہا لیکن اجازت نہیں دی گئی۔ پھر امام نے وضو کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔اس کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔حتیٰ کہ تیمّم کرنے کی بھی سہولت نہیں دی۔امام نے اسی حالت میں گاڑی میں نماز پڑھی۔ ایک واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے عالمی صاحب نے کہا کہ امام کو حراست میں لینے والے امام سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔امام نے سوال کیا کہ وہ کیوں ڈرتے ہیں؟۔

ایران کلچرل ہاؤس میں مہمانوں نے ناشتہ کیا اور ایک اہلکار نے انہیں ویزا لگا پاسپورٹ اور جہاز کا ٹکٹ حوالے کیا۔اس کے بعد عالمی صاحب اور دوسرے اہلکاروں نے شرکا کو الوداع کیا۔

ایران ایئر لائنز کے ماہان طیارے میں ہمیں سفر کرنا تھا۔پونے ایک بجے دہلی سے جہاز نے پرواز کیا۔ جب جہاز پاکستان کے علاقے میں داخل ہوا تو ہوا باز نے اس کا اعلان کیا۔ اکثر مندوبین پہلی مرتبہ ایران جارہے تھے۔اس لئے ان کے ذہن میں ایک تجسس تھا کہ ایران کیسا ہوگا؟ امام کی برسی پر ان کا سفر کیسا رہے گا؟

ایران کی تاریخ کھلی کتاب کی طرح ہے۔دنیا کے چند گنے چنے ملکوں کی طرح

ایران انسانی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے اور مطلق العنانیت کا گڑھ بھی رہا ہے۔ ایران کا مطلب ''آریاؤں کا ملک'' ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ پہلے پہل میڈے، نام کے ایک قبیلے نے ایران میں حکومت کی تھی۔ ہمدان اس کا درالخلافہ تھا۔ ۵۵۹ ق م قبل مسیح سائرس نے میڈے کو شکست دی اور ایران کا حکمران بنا۔ ۳۳۱ ق م قبل مسیح سکندر اعظم نے ایران فتح کیا اور اپنی قلم رو میں شامل کیا۔ یونانیوں نے اس کا نام پرشیا رکھا۔

چھٹی صدی ق م میں یہاں زرتشت پیدا ہوئے اور پارسی مذہب دیا۔ چند مورخین کے مطابق زرتشت کی پیدائش سن ایک ہزار اور آٹھ سو قبل مسیح کے درمیان ہوئی۔

تیسری صدی میں مانی نے ایران میں مانی ازم فرقہ کی بنیاد ڈالی اور یہ مصر، شمالی افریقہ اور مغرب پہنچا۔ مانی خود مارا گیا۔ اب اس مذہب کا کوئی پیروکار نہیں ہے۔

ساتویں صدی میں پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کو ایک قاصد کے ذریعے اسلام کی دعوت دی اور اسی صدی میں حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں عرب ایران پر قابض ہوئے۔ تب ایران پر ساسانی حکمران یزدگرسوم کی حکومت تھی۔ خلافت نے ملوکیت کی صورت اختیار کی۔ اپنی لمبی تاریخ کے دوران ایران پر ڈھائی ہزار سال تک مطلق العنان حکمرانوں کی فرمانروائی رہی۔ اسی دوران آزادی پسندوں نے متعدد بار بغاوت کا علم بلند کیا۔ ایران نے فردوسی، عمر خیام، نظامی، حافظ، سعدی، فاضلی، لاہوتی، فارخی اور احسان طبری جیسے عظیم شعرا پیدا کئے۔ جنہوں نے عام لوگوں کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی اور سماجی انصاف کے لئے آواز بلند کی۔

محمد رضا شاہ پہلوی نے ایرانی بادشاہت کو حق بجانب قرار دینے کے لئے اپنے خاندان کو سائرس کے ساتھ جوڑا اور سائرس کا ڈھائی ہزاروں سال دھوم دھام سے

منایا۔شاہ نے ۱۹۷۶ء میں ایک نیا کلینڈر جاری کیا جو سائرس دوم کی ۲۵۳۵ میں تخت نشینی سے شروع ہوتا ہے۔

ساڑھے تین گھنٹے کی اڑان کے بعد ہوائی جہاز تہران کے امام خمینی بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترا ایرپورٹ وسیع رقبے میں پھیلا پھیلا ہوا ہے۔ اس کے باہر ہمارے لئے دو بسیں کھڑی ہوئی تھیں۔ ہوائی اڈے سے تہران تک کا ۴۲ کلو میٹر کا فاصلہ ہم نے انہی بسوں میں طے کیا۔ دوطرفہ سڑکیں ہیں جن پر گاڑیوں کی آمد رفت کے لئے چار یا کہیں تین لائنیں ہیں۔ چھوٹی بڑی گاڑیاں دونوں طرف فراٹے سے گزر رہی تھیں۔ شاہ راہ کے دونوں طرف وسیع میدان ہیں جن پر چھدری چھدری گھاس اگی ہے۔۔ سڑک کے دونوں طرف چگلی JUNPER قسم کے پیڑ قطاروں میں کھڑے ہیں۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا کہ یہ چیڑ کے پیڑ لگتے ہیں۔

شہر کے نزدیک ہریالی گہری ہوتی گئی۔ پہلی نظر میں شہر بڑا صاف ستھرا لگا ۔بھیڑ بھاڑ کم تھی۔۔ کہیں کہیں سر پر اسکارف لگائیں عورتیں نظر آتی تھیں۔ کہیں کہیں امام خمینی کی تصویریں نظر آئیں۔ دو تین جگھوں پر امام خامنہ ای تصویر بھی ساتھ تھی بس سے نکل کر جب ہم ہوٹل میں داخل ہوئے تو ہمارے دو تین ساتھی بولے ''ایران بڑا خوبصورت اور صاف ستھرا شہر ہے''

ہوٹل کے استقبالیہ ہال میں ہم نے دھیما دھیما نغمہ سنا۔ایک کونے میں ایک نوجوان پیانو بجا رہا تھا۔ ہماری رہائش کا انتظام ہوٹل پارشین انقلاب میں کیا گیا تھا۔ یہ فایو اسٹار ہوٹل سولہ منزلہ ہے۔ اس میں تین ڈائننگ ہال ہیں۔ جن میں بیک وقت بارہ سو آدمیوں کی سروس کی جا سکتی ہے۔ پہلی منزل پر ایک مسجد ہے۔ مسجد کے متصل ہال میں ہماری آمد کے بعد کتابوں کی نمائش کی گئی۔ یہ کتابیں امام خمینی

نے کی لکھی ہوئی ہیں یا ان کے بارے میں ہیں۔انگریزی اور اردو میں امام کی لکھی ہوئی ترجمہ شدہ کتابیں بھی دستیاب ہیں

شہر پر طائرانہ نظر سے یہ لگتا تھا کہ امریکہ اور اس کے حلیف ملکوں کی پابندیوں (Sanctions) کا بظاہر عام ایرانی زندگی پر کچھ اثر نہیں پڑا ہے۔زندگی رواں دواں تھی۔لوگ خوش وخرم نظر آرہے تھے اور شہر میں کہیں کہیں تعمیرات چل رہی تھیں۔

3رجون کو ایران کے روحانی رہنما امام خامنہ ای نے امام خمینی کے یوم وفات پر ایک عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا:''پابندیاں ایران کے لئے مفید ثابت ہوئی ہیں۔پابندی نے ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا ہے اور ایرانیوں میں خود اعتمادی پیدا کی ہے۔ہم ان ملکوں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے ہم پر پابندیاں عائد کی ہیں۔''

30رمئی کو کوئی پروگرام نہیں تھا۔ہم نے قم جانے کا پروگرام بنایا۔ہم بارہ افراد تھے۔تہران سے قم پہنچنے میں ہمیں تین گھنٹے لگے۔امام خمینی انٹرنیشنل ائیرپورٹ سے ڈیڑھ گھنٹے لگتے ہیں۔دوطرفہ چوڑی سڑکیں ہیں۔دائیں بائیں ریتلے میدان ہیں۔جن میں کہیں کہیں چھدری گھاس اُگی ہے۔میدان سے قدرے پرے ریت کے ٹیلے جیسی پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔

قم بڑا شہر ہے اور اپنی زیارت گاہوں اور مدارس کے لئے مشہور ہے۔امام خمینیؒ نے مطلق العنانیت کے خلاف اپنی تحریک یہیں سے شروع کی تھی۔قم میں دستار باندھے عبا پوش باریش افراد اور چادر اوڑھی خواتین عام نظر آتی ہیں۔

قم میں مسجد جمکران ہے جو بارہویں امام،امام مہدی آخرالزماں کی یاد میں تعمیر کی گئی ہے۔امام غائب ہوگئے تھے مسجد جمکران بڑی عالیشان ہے۔

یہاں معصومہ فاطمہ کا روضہ ہے۔وہ امام موسیٰ کاظم کی صاحبزادی اور امام علی رضا کی بہن تھیں اور بڑی پاکباز خاتون تھیں۔دونوں زیارت گاہوں میں مہمانوں نے

نماز ادا کی ۔ فاطمہ معصومہ کے روضہ کے گرد و نواح میں وسیع رقبے میں سنگ مرمر کا فرش بچھا ہے۔ میرے سوال پر کسی نے بتایا کہ یہ کام انقلاب کے بعد ہوا ہے۔

یہاں ہماری ملاقات ہندوستان سے آئے ہوئے چند طلبہ سے ہوئی جو مدارس میں زیر تعلیم ہیں۔ انہیں فارسی آتی تھی۔ ان کی مدد سے ہم نے ہندوستانی کرنسی کا ریال سے تبادلہ کیا اور ہمارے کئی ساتھیوں نے تبرکات وغیرہ خریدے۔

لداخ کے شیعہ مسلک کے متعدد طلبہ قم اور عراق کے اہم دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ طلبہ حصول تعلیم کے بعد اپنے علاقوں میں ائمہ، شیوخ اور شرعی علما کا فریضہ ادا کرتے ہیں

لداخ اور اس کا ہمسایہ بلتستان میں سب سے پہلے اسلام کا پیغام برگزیدہ صوفی عالم میر سید علی ہمدانی لائے اور بہت سارے لوگوں نے ان کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ لداخ اور بلتستان میں پہلی مساجد انہوں نے تعمیر کیں۔ میر سید علی ہمدانیؒ ایران کے شہر ہمدان کے رہنے والے تھے۔ اسی نسبت سے ان کو کشمیر، لداخ اور بلتستان میں شاہ ہمدان کہتے ہیں۔ لداخ اور ایران کے مابین اسی لئے دیرینہ رشتہ ہے۔ میں نے اپنی کتاب ''لداخ تہذیب وثقافت'' میں لکھا ہے: ''جس طرح تبت کے ساتھ لداخ کے بودھوں کا مذہبی رشتہ ہے۔ اسی طرح خاص کر لداخ کے شیعہ مسلمانوں کا ایران اور عراق کے ساتھ مذہبی تعلقات ہیں۔ ہر سال لداخ سے بہت سارے مسلمان کربلائے معلیٰ، قم، مشہد اور دوسرے مذہبی مقامات کی زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ کرگل کی تہذیبی اور مجلسی زندگی میں ان کا گہرا اثر ورسوخ ہے اور مذہبی مسائل میں ایران کے مجتہدوں کی رہبری حاصل کرتے ہیں۔ ان دو اجنبی ثقافتوں کے اتصال سے لداخ کے اس خطے میں ایک نئی ثقافت نے جنم لیا ہے۔''

ہندوستان میں تعینات اسلامی جمہوریہ ایران کے سفیر اور ایران کلچرل ہاؤس کے

کلچرل کونسلر اور دوسرے زعما لداخ آتے رہتے ہیں۔ ان کے اعزاز میں تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ جن میں لداخی بودھوں اور عیسائیوں کے نمائندے بھی شرکت کرتے ہیں۔

امام خمینیؒ کی برسی کے اس ہفتے کے دوران ہندوستان میں تعینات اسلامی جمہوریہ ایران کے سفیر جناب سید مہدی نبی زادہ اور ایران کلچرل ہاؤس کے کارگزار کلچرل کونسلر احمد عالمی کرگل کی مسلم تنظیموں کی دعوت پر لداخ میں تھے۔ میں نے سنا، انہوں نے امام خمینیؒ کی برسی اور حضرت علیؑ کے یوم ولادت کی تقریبات میں شرکت کی۔ انہوں نے لیہہ کا بھی دورہ کیا اور لیہہ کے پاس چھشوت امامیہ مشن اسکول میں امام خمینی کی یاد میں منعقدہ ایک میٹنگ میں شرکت کی۔ انہوں نے شے میں شاہ ہمدان مسجد اور لیہہ میں سنی مسلمانوں کی جامع مسجد میں بھی حاضری دی اور حاضرین سے خطاب کیا۔

قم امام خمینیؒ کی بادشاہت کے خلاف اپنی جدوجہد اور اسلامی نظام حکومت کے قیام تحریک کے پیش نظر ایک اہم مرکز کی حیثیت سے مشہور ہے۔

فاطمہ معصومہ کے روضہ کے پاس امام کا مکان ہے جو تحریک کا محور تھا۔ ٹائمز آف لندن کے مطابق امام کی شخصیت میں ساحرانہ کشش تھی۔ جس نے لوگوں کو ان کی طرف کھینچ لیا۔

رضا شاہ پہلوی کے خلاف ۳؍ جون ۱۹۶۳ء کو امام نے قم میں ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور شاہ اور اسرائیل کے مابین خفیہ دوستانہ تعلقات کا انکشاف کیا۔ ۵؍ جون کی رات تین بجے امام کے مکان کو شاہ کے کمانڈوز اور ساواک کے ایجنٹوں نے گھیر لیا اور پو پھٹنے کے ساتھ امام کو گرفتار کر کے تہران لے گئے اور قصر جیل میں قید کیا۔ اس گرفتاری کے خلاف سارے ملک میں مظاہرے اور شورش ہوئی۔ شاہ کے خلاف یہ

پہلی بڑی اعلانیہ بغاوت تھی۔ سب سے بڑا مظاہرہ قم میں ہوا۔ شاہ نے مارشل لا نافذ کیا۔ ہزاروں لوگ مارے گئے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۱۵۴۰۰ لوگوں کی جانیں گئیں۔ لوگوں کے غم و غصے کو دیکھ کر مطلق العنان حکومت نے امام خمینی کو رہا کیا اور وہ قم واپس لوٹے۔ تب ان کو قصر جیل سے عشرت آباد گریسن منتقل کیا گیا تھا۔ قم میں اپنی پہلی تقریر میں امام نے کہا:

"وہ ہم کو رجعت پسند کہتے ہیں۔ کئی غیر ملکی اخبارات میں یہ لکھنے کے لئے خوب رشوت دی جاتی ہے کہ ہم تمام اصلاحات کے خلاف ہیں اور ایران کو زمانہ وسطیٰ میں واپس لینے کے لئے کوشاں ہیں۔ ہم تہذیب و تمدن کی مخالفت نہیں کرتے ہیں اور نہ اسلام ایسا کرتا ہے۔ اس حکومت نے سارے قوانین کی خلاف وزی کی ہے۔ چاہے انسانی قوانین ہوں یا خدائی قوانین ہوں...... ہم عورتوں کی آزادی کے خلاف نہیں ہیں۔ البتہ ہم نہیں چاہتے کہ عورتیں مردوں کے لئے کھلونا بنیں۔"

ہم نے ایران میں ایک ہفتہ کے قیام کے دوران اس کا عملی نمونہ دیکھا۔ زندگی کے ہر میدان میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔ دفاتر، کاروباری ادارے یا ہوٹل، ائیر پورٹ غرض ہر جگہ عورتیں کام کر رہی ہیں۔ ہم نے سنا تہران یونیورسٹی میں ساٹھ فیصد لڑکیاں ہیں۔ اسلامی شعائر کے مطابق عورتوں نے سکارف میں اپنے بالوں کو چھپایا ہے۔ بھڑ کیلے لباس نہیں پہنا ہے۔ چہرے پر میک آپ نہیں۔ غرض عورتوں نے دوسروں کی نظر میں اپنے آپ کو پر کشش بننے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اسی میں ان کی نسائیت نکھر آئی ہے اور عورت کا فطری حسن دوبالا ہوا ہے۔ ویسے بھی ایران کی عورتیں بڑی خوبصورت ہیں۔

۴ر نومبر ۱۹۶۴ء کو قم میں ایک اور مرتبہ امام کے مکان کا فوج اور ساواک کے خفیہ ایجنٹوں نے محاصرہ کیا اور امام کو حراست میں لے کر سیدھا تہران کے مہر آباد ہوائی اڈہ

پر لے گئے، جہاں سے انہیں ترکی جلاوطن کیا گیا۔ بہت سارے مذہبی رہنماؤں کو قید کیا اور دوسرے علما کی حرکات وسکنات پر کڑی نظر رکھی گئی۔

ایک دفعہ پھر قم میں لوگوں نے سڑکوں پر آکر احتجاج کیا۔ فوج نے گولیاں چلائیں۔ ۹۰ لوگ مارے گئے۔ پانچ سو زخمی ہوئے۔ مرنے والوں کی لاشیں تہران لائی گئیں۔ شورش پورے ملک میں پھیل گیا۔ بارہ شہروں میں مارشل لا نافذ کیا گیا۔ صرف تہران میں ۳۸۹۷ لوگ مارے گئے۔

قم سے ہم سہ پہر کو تہران لوٹے۔ امام خمینی کی برسی کی تقریبات میں حصہ لینے کے لئے پاکستان اور افغانستان سے بہت مہمان مندوبین پہنچے تھے۔ پھر دوسرے ممالک سے مہمان پہنچنے لگے۔ ان میں بہتوں کو ہوٹل استقلال اور ایک اور ہوٹل میں رکھا گیا شرکا میں مختلف سماجی پس منظر کے لوگ تھے۔ علما، قلم کار، پروفیسر، جج، کسان، تاجر، ریسرچ اسکالر وغیرہ۔ ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور مصر سے بڑی تعداد میں مہمان آئے تھے۔ بمبئی کے راستے سے بھی ہندوستانی مہمان آئے تھے۔ ایک ہفتہ کے دوران جن سے میری علیک سلیک ہوئی یا مختصر طور پر سلام کلام ہوا۔ ان سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ چین، روس، ترکی، کینیا، گھانا، جنوبی افریقہ، کویت، عراق، شام، نائیجریا، لبنان، سری لنکا، وینیز یلا، سینگال، موراٹیا، انگلینڈ، بلجیم، ہالینڈ، تاجکستان، الجیریا، جارجیا، جارڈن، آذربائی جان، وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے سنا کہ ملیشیا سے بھی کئی مندوبین آئے ہیں۔ انڈونیشیا، بنگلہ دیش اور نائیجریا جیسے بڑے اسلامی ممالک کے کسی وفد سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ ان ملکوں سے بھی مہمان آئے ہوں گے۔ چین سے آئے شنگھائی کے دو امام موسیٰ جین اور ابراہیم سے میری کئی بار ملاقات ہوئی۔ موسیٰ جین شنگھائی اسلامک ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں۔ دونوں عربی جانتے تھے۔ دونوں نے سفید ٹوپی پہن رکھی تھی۔ موسیٰ جین نے مجھے انگریزی

میں بتایا کہ دونوں شنگھائی کی دو مساجد میں امام ہیں۔ شنگھائی میں دو لاکھ ستر ہزار مسلمان ہیں اور جامع مسجد سمیت سات مساجد ہیں۔ روس سے دو افراد آئے تھے ایک مسلمان تھا اور مسلم اکثریتی علاقہ قازان کا رہنے والا تھا۔ دوسرا عیسائی تھا اور پیشے سے صحافی تھا۔ وینیلا اور آرمینیا کے غیر مسلم مہمان ماہرین مستشرقیات (Orientallsts) تھے۔ میں نے سنا کہ مہمانوں کی کل تعداد لگ بھگ چار سو ہے۔

۳۱ رمئی کو ہم ایوان صدر گئے جہاں صدر محمود احمدی نژاد خطاب کرنے والے تھے۔ کارروائی کا آغاز کلام پاک کی تلاوت اور ایران کے قومی ترانے سے ہوا۔ غیر ملکی شرکا کو ائیرفون دیا گیا۔ جس سے فارسی اور عربی تقاریر کا ترجمہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں ہو رہا تھا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایسوشیایٹ پروفیسر ڈاکٹر اقتدار محمد خان نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ امام آیت اللہ خمینی کی حیات اور کارنامے تمام دینائے اسلام کے لئے مشعل راہ ہیں۔ انہوں نے ایران کو شہنشاہیت سے نجات دلا کر انقلاب سے ہمکنار کیا۔ اور محکوموں اور مظلوموں کے لئے ایک مثال رکھی۔ شاہ نے ۱۹۳۱ء میں اسکولوں میں دینیات کی درس وتدریس ختم کی اور ۱۹۳۲ء میں برقعہ ممنوع قرار دیا۔ شاہ مخالف سرگرمیوں کے لئے ایک عالم شیخ نوری کو شہید کیا۔ ۱۹۶۳ء میں امام خمینیؒ نے قیادت سنبھالی اور لوگ ان کے پرچم تلے جمع ہوئے

پروفیسر نزہت معینی نے کہا کہ پچھلے دو دنوں میں ہم نے جو مشاہدہ کیا۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ایران دنیا کے تمام مسلمانوں کو سچی راہ دکھا سکتا ہے۔ پروفیسر نزہت معینی علی گڑھ یونیورسٹی میں نفسیات پڑھاتی ہیں۔ وہ اور پروفیسر اقتدار محمد خان دونوں حنفی مسلک کے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک اور استاد ڈاکٹر قمر غفار نے فارسی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے امام خمینی سے اپنی مختصر ملاقات

کا ذکر کیا۔ امام سے چند منٹوں کی یہ ملاقات ان، کے لئے ایک اہم یادگار اور سرمایہ حیات تھی۔

لبنان کے ایک نوجوان مقرر نے اپنی جذباتی تقریر میں فلسطینیوں کے تئیں امام کی خدمات کا ذکر کیا اور کہا کہ امام شروع سے ہی فلسطین کی آزادی کے علم بردار تھے اور صیہونیت کے خلاف تھے۔

آخر میں صدر محمود احمدی نژاد نے تالیوں کی گونج میں کہا: کیا میزبان، کیا مہمان، سبھی امام کے ثناخواں اور مداح ہیں۔ دنیا میں امام کے بہت سے پرستار ہیں۔ امام کو وفات پائے ۲۳ سال ہوئے ہیں۔ ان کا پیغام اوران کی زندگی زندہ جاوید ہیں۔ صدر نے تمام مکاتب خیال کے مسلمانوں میں اتحاد پر زور دیا۔انہوں نے کہا کہ قرآن، بنی کریمؐ اور اسلام صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے۔

اجلاس کے اختتام پر مہمان صدر سے ملاقات کے لئے بڑھے اور اس طرح ان پر ٹوٹ پڑے کہ صدر کے محافظوں کے لئے بڑا مسئلہ بن گیا۔ صدر احمدی نژاد نے اس بے قابو ہجوم میں خندہ پیشانی سے سبھوں سے ہاتھ ملایا۔ معانقہ کیا، بوسہ لیا اور بوسہ دیا

ایوان صدر میں مہمانوں کے لئے ظہرانہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ ظہرانہ سے پہلے مہمانوں کا چائے، پھلوں کا رس اور دیگر ضیافتوں سے تواضع کی گئی۔

اس کے بعد ہمیں امام خمینیؒ کی قیام گاہ لے جایا گیا۔ جسے اب قومی ورثہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ دو کمروں اور کچن پر مشتمل ہے۔ امام نے یہ چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیا تھا اور انقلاب کے بعد بھی اسی میں قیام کیا۔ امام کے کمرے میں ایک بوسیدہ چارپائی اور فرش پر ایک پرانا قالین ہے۔ امام اسی میں غیر ملکی اکابرین سے ملتے تھے۔ امام کی زندگی سادگی اور انکساری کی ایک زندہ مثال تھی۔ اس ضمن میں ایران کے مقررین نے

امام کو مہاتما گاندھی سے مثال دی۔ ان کے مکان کے سامنے ایک چھوٹی سی مسجد ہے جہاں امام امامت اور وعظ و تلقین کرتے تھے۔ ہم نے سنا کہ امام کی زندگی میں یہاں عقیدت مندوں کا جم غفیر تھا اور سیکورٹی کے عملہ کو انہیں قابو میں رکھنا بڑا دشوار رہتا تھا۔ یہ جگہ پہلے ایک گاؤں تھا جو جمران کہلاتا تھا۔

اب مکان کے متصل ایک میوزیم کھولا گیا ہے۔ جس کی گیلریوں میں تصاویر کی زبانی امام کی زندگی کی کہانی اور ان کی جدوجہد اور سرگرمیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ہر تصویر میں امام سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ میں نے صرف ایک تصویر دیکھی جس میں وہ زیر لب تبسم فرما رہے تھے۔ جب میں نے ایک مہمان کا دھیان اس طرف دلایا تو ایک ایرانی لڑکی نے میری بات سمجھ لی اور وہ مسکراتی ہوئی دلچسپی سے تصویر کو دیکھنے لگی۔ ترکی سے امام خمینی عراق آئے اور نجف میں قیام کیا۔ درس و تدریس، تصنیف اور سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ انہوں نے ظالم حکمران کے خلاف مضامین لکھے۔ تقاریر کیں اور بیانات دئے۔ انہوں نے عراقی حکومت کی اس شرط کو نہیں مانا کہ وہ خاموش رہیں۔ آخر کار رضا شاہ پہلوی کے اشارے پر عراقی فوج نے ۲۴ ستمبر ۱۹۷۸ء کو نجف میں امام کے مکان کو گھیرے میں لیا اور انہیں عراق سے نکال دیا۔ امام نے کویت جانا چاہا لیکن اجازت نہیں ملی۔ آخر کار انہوں نے فرانس کی راہ لی۔

ٹی این کول نے کتاب Persia to Iran (مصنف تلسی رام) کے پیش لفظ میں لکھا ہے: ''شاہ نے وقت کے گھڑیال کو پیچھے کرنے کی کوشش کی ہے۔'' وہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ایران میں ہندوستان کے سفیر رہے۔ اپنی یادداشت کے سہارے وہ لکھتے ہیں:

''وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے شاہ کے ساتھ محل میں لنچ کرتے ہوئے گھٹن محسوس کی جب انہوں نے فوجیوں کو خودکار بندوقیں اٹھائے محل پر پہرہ دیتے اور ڈائیننگ روم کے باہر گشت کرتے ہوئے دیکھا۔ پنڈت جی بولے مجھ سے یہ دیکھا

نہیں جاتا۔"

آگے وہ رقم طراز ہیں:۔

جب شاہ کے کارندوں نے انہیں ایک بند کار میں دیہی علاقوں میں گھومنے کے لئے کہا تو پنڈت جی نے احتجاج کرتے ہوئے آگے جانے سے انکار کردیا۔ تب میزبانوں کو ایک کھلی کار فراہم کرنی پڑی اور ہم گھومنے گئے۔"

ٹی این کول۔ نے جو بعد میں خارجہ سکریٹری بھی رہے، لکھتے ہیں:

"ہندوستان اور ایران کے سامنے شاندار مستقبل ہے۔ دونوں علاقائی امن اور سلامتی کے قیام اور دونوں ملکوں اور پورے خطے میں قومی آزادی کی حفاظت اور ترقی کو بڑھاوا دینے کے لئے ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس مشترکہ جدوجہد میں ہمیں جنوبی ایشیا اور جنوب مغربی ایشیا میں غیر ملکی مداخلت اور غلبہ۔ کے خلاف باہمی دوستی، تعاون اور عدم جارحیت کے معاہدوں کے ذریعے متحد ہونا چاہئے۔"

امام خمینی کے میوزیم اور قیام گاہ دیکھنے کے بعد ہمیں شاہی محلات دکھانے لے گئے۔ پہاڑ کے دامن میں پرفضا مقام پر ایک بڑے شاداب باغ میں یہ محلات واقع ہیں۔ دور برفانی پہاڑ سے پانی آتا ہے اور باغ میں ایک ندی بہتی ہے۔ اب یہ محلات عوام کی نمائش کے لئے کھلے ہیں۔ محل کے دیوان خانے، ڈرائینگ ہال، خواب گاہ، دارالمطالعہ اور دوسرے کمرے آرٹ کے شہہ پارے، قیمتی اور عیش وعشرت کے سامان سے آراستہ ہیں۔ بچوں کے لئے الگ محل ہے، جس میں کھلونے اور کھیل کے سامان ہیں۔

محلات جہاں شاہانہ سطوت اور جاہ وحشمت کی علامت ہیں، وہاں اپنے زوال کی داستان سنا رہے ہیں۔

یکم جون کو ہمارے پروگرام میں تہران یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں نماز جمعہ ادا کرنا تھا۔ امام خمینیؒ نے نماز جمعہ بلاناغہ پڑھنے کی تاکید کی ہے اور شعیہ مسلک کے مسلمانوں

کو ہدایت دی ہے کہ وہ حنفی مسلک یا اہل سنت کے امام کی امامت میں نماز ادا کرسکتے ہیں۔امام نے اس ضمن میں اپنے عمل سے دوسروں کے لئے ایک مثال قائم کی ہے۔

میں نے ایران میں دیکھا، جہاں کہیں لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے وہاں باجماعت نماز پڑھنے کے لئے مسجد ہے۔دوسری بات میں نے دیکھی کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ایئر پورٹ سمیت کہیں بھی کھڑے کھڑے پیشاب کرنے کی سہولت نہیں ہے۔ صرف غسل خانے ہیں، جہاں پردہ رہتا ہے۔

ہر تقریب کا آغاز کلام پاک کی تلاوت سے ہوتا ہے۔

تہران یونیورسٹی گراؤنڈ پر ہم سے پہلے بہت سے لوگ نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے پہنچے تھے۔اور ہر لمحہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔مہمانوں کے لئے سامنے جگہ رکھی گئی تھی۔۔اسٹیج پر ایک خوش نوا آدمی فارسی میں نعت یا قصیدہ پڑھ رہا تھا۔

نماز سے پہلے ایران کے وزیر خزانہ اور تجارت نے تقریر کی۔ہمیں سمجھ میں نہیں آئی۔پھر امام نے خطبہ پڑھا اور امامت کی۔

لنچ کے بعد ہمیں برج میلاد یا میلاد ٹاور دیکھنے کے لئے لے جایا گیا۔یہ دنیا کے پانچ بلند ترین ٹاوروں میں شمار ہوتا ہے۔پیرس کے ایفل ٹاور سے کہیں زیادہ اس میں گونا گونی، رنگا رنگی اور دلچسپی اور تفریح کا سامان تھا۔یہ ۲۰۰۰ء میں بنا تھا۔

برج میلاد جدید فن تعمیر، ایرانی آرٹ اور اس کی ثقافت کی علامت ہے۔کلی طور پر اس کی بلندی ۴۳۵ میٹر ہے۔یہاں ہر وقت بھیڑ رہتی ہے اور ایک اہم سماجی مرکز بنا ہے۔اس کا کل وزن ۱۵۰ ہزار ٹن بتایا جاتا ہے۔۲۸۰ میٹر لیول پر اس کا قطر ۶۰ میٹر ہے۔وہاں نیلی وردی میں ملبوس لڑکیاں انگریزی میں معلومات فراہم کر رہی تھیں۔اس کی تعمیر کے لئے ۲۱ مقامات انتخاب کئے گئے اور آخر کار یہی مقام پسند کیا گیا۔اس کے ڈیزائن میں زلزلہ اور تیز آندھی سے تحفظ کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

ماہرین کے مطابق اگلے ۱۱۰سال تک اس کو بھونچال سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ٹاور کی عمارت کے فرش کا رقبہ ۱۷ہزار مربع میٹر ہے۔ لابی میں چھ برقی سیڑھیاں (Escalators) ہیں جو ہر گھنٹہ ۹ ہزار آدمیوں کو اوپر نیچے لے جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ یہاں چار لفٹ ہیں۔ ہر لفٹ میں ۲۱ لوگ آسکتے ہیں۔

پہلی اور دوسری منزلیں زیرزمین ہیں۔ پہلی تین منزلوں میں گھومنے والا ریستوران، کیفیٹریا ۸۳ کاروباری ادارے یونٹ اور رہائشی جگہ ہے۔ اوپر لے جانے کے لئے چھ لفٹ ہیں، جو ایک سیکنڈ میں سات میٹر چڑھتے ہیں اور سیلانیوں کو پچاس سیکنڈ سے کم وقت میں ٹاور کے اوپر لے جاتے ہیں۔ ہنگامی حالت اور آگ لگنے کی صورت میں بچاؤ کے لئے ایک جگہ مخصوص کی گئی ہے، جس پر چھ سو لوگوں کے رہنے کی گنجائش ہے۔ تیسرے فلور سے شہر کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی فلور سے سیڑھیوں کے ذریعے کیفیٹریا، آرٹ گیلری اور گھومنے والے ریستوران تک رسائی ہوتی ہے۔ کیفیٹریا سے کافی پیتے ہوئے شہر کا نظارہ کیا جاتا ہے۔ پانچویں منزل پر آرٹ گیلری ہے۔ جہاں آرٹ کی نمائش ہوتی ہے اور یہ اچھے روزگار کا وسیلہ بنا ہوا ہے۔ ہم نے یہاں لڑکے لڑکیوں کو مصوری، پیپر ماشی اور دوسرے ہنر میں لگے دیکھا ہے۔ چھٹے فلور میں ۲۷۶ میٹر کی بلندی پر ریستوران ہے۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا گھومنے والا ریستوران ہے۔ اس میں تین سو آدمیوں کو کھانا کھلایا جاسکتا ہے۔ یہاں فردوسی کی مشہور تصنیف شاہنامہ پر مبنی شاہکار تصویریں ہیں۔ ریستوران کا ایک حصہ ساکن اور دوسرا حصہ متحرک ہے جو ایک گھنٹے میں پورا چکر کاٹتا ہے۔ احتیاطاً کھانا دوسری جگہ پکایا جاتا ہے اور خصوصی لفٹ کے ذریعے یہاں پہنچایا جاتا ہے۔ ساتویں فلور پر ۲۸۰ میٹر کی بلندی پر ٹاور کا قطر تقریباً تین ہزار میٹر ہے۔ اتنا لمبا قطر ٹاور میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ اس پلیٹ فارم سے لوگ سارا تہران دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں کا رقبہ ۱۱۰۰ مربع

میٹر ہے۔ یہاں سو سے زائد سرکاری مہمانوں کی تواضع کی جا سکتی ہے۔ اور نظارہ کے لئے ایک پلیٹ فارم ہے۔ ٹاور کے آخری پبلک فلور پر اساطیری اور دیومالائی حکایات پر مبنی آرٹ کا ٹادر نمونہ ہے جو ۹ ہزار سالہ ایران کی عظیم سلطنت اور شاندار اسلامی دور کی ثقافت اور تہذیب کے ارتقا کا مظہر ہے۔

برج میلاد کا انٹینا ۱۲۰ میٹر اونچا ہے۔ جس کا زیریں ترین قطر چھ میٹر ہے اور چوٹی پر یہ ساٹھ مربع سینٹی میٹر ہے۔ اس کے اندر ایک لفٹ ہے جس میں دو آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہے۔ یہ لفٹ برج کے ماہرین کو ۳۸۵ میٹر کی اونچائی تک لے جاتا ہے۔ آٹھ ضلعوں والے اس برج کے زیریں حصے میں ایک مسجد ہے۔ ہم نے یہاں دو رکعت نماز ادا کی۔

۲ر جون کو ہم نے ایک سیمینار میں شرکت کی۔ سیمینار کا موضوع ''سیاست میں اخلاقیات'' تھا۔ مترجم تقاریر کا انگریزی اور عربی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ ہمیں حسب معمول ایئرفون فراہم کیا گیا۔ سرکردہ مقررین میں امام خمینی کے پوتے حجتہ الاسلام حسن خمینی اور ایران کے دانشور ڈاکٹر لاری جانی تھے۔ سید حسن خمینی نے منطق اور دلائل سے وضاحت کی کہ سیاست کو مذہب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام میں اخلاقیات بدرجہ اتم ہے۔ پیغمبر اسلام کی سیرت پاک سیاسیات میں اخلاقیات کی اہمیت کے ضمن میں ایک بہترین نمونہ ہے۔ امام علی نے اسی کو اپنایا اور امام خمینی نے ان کی تقلید کی۔

ڈاکٹر لاری جانی نے کہا کہ آج کی سیاست میں دوغلاپن ہے۔ اس میں اخلاقیات کو کوئی جگہ نہیں۔ امریکہ ایران کو ابھرتا ہوا ایک طاقتور ملک دیکھنا نہیں چاہتا اور اسی مقصد سے صدام حسین سے ایران پر حملہ کرایا۔ پھر نیوکلیائی ہتھیاروں کی موجودگی کے بہانے عراق پر حملہ کیا۔ بھاری جانی اور مالی نقصان ہوا۔ کوئی تباہ کن

ہتھیار نہیں نکلا اور کسی مقصد کے حصول کے بغیر عراق سے چلا گیا۔ڈاکٹر جانی نے سامراجیت کا مقابلہ کرنے کے لئے عالم اسلام میں اتحاد کی افادیت پر زور دیا۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر لیاقت حسین معینی نے نہج البالغہ کے حوالے سے بتایا کہ مسلم معاشرہ میں ملوکیت اور موروثی باشاہت کا سر اٹھتے دیکھ کر حضرت علیؓ نے جو پتے کی بات کہی تھی، آج کی سیاست پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا: ''میں سیاست جانتا ہوں لیکن ان کی طرح جھوٹ نہیں بول سکتا۔ سچائی کو جھٹلا نہیں سکتا ہوں۔ میں ناانصافی نہیں کرسکتا ہوں۔''

سید حسن خمینی امام خمینی کی نگارشات کی تصنیف اور تالیف سے متعلق انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہیں۔ ان ادارہ نے امام خمینی کی کتابیں مختلف زبانوں میں شائع کی ہیں۔

۳/جون کو امام خمینی کا یوم وفات تھا۔ اس روز امام کے روضہ پر عوامی جلسہ تھا۔ ہمیں اس میں شرکت کے لئے خصوصی شناختی کارڈ جاری کئے گئے۔ہم نے روضہ جاتے ہوئے دیکھا کہ ہزاروں لوگ گاڑیاں اور پیدل امام کے روضہ کی طرف جارہے تھے۔جب ہم روضہ کے وسیع احاطہ میں پہنچے تو ایران کے روحانی لیڈر امام خامنہ ای نے اپنی تقریر شروع کی۔ میرے خیال میں یہ ایک معرکتہ الآرا تقریر تھی۔ ہمیں ایئرفون دیا اور اس کا انگریزی ترجمہ مل رہا تھا۔روضہ کا احاطہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا اور باہر اس سے زیادہ لوگ تھے۔ امام خامنہ ای نے کہا کہ ایران آج ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ شرح پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ ایران کو آج جو وقار ملا ہے وہ امام خمینی کی دین ہے۔انہوں نے کہا کہ دوسری جنگ کے دوران چرچل، روز ویلٹ اور اسٹالن نے تہران میں ایک میٹنگ کی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے شاہ سے اجازت تک نہیں لی تھی۔ شاہ ان سے ملنے گئے تو وہ اٹھے تک نہیں۔ شاہ کو بڑی ذلت اٹھانی پڑی۔ اسے اپنی عزت نفس کا احساس نہیں تھا۔

امام خامنہ ای نے عرب اسپرنگ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حسنی مبارک کے زمانے میں غزہ پٹی میں مصر نے ناکہ بندی کر رکھی تھی اور فلسطینیوں کو فاقہ کشی کرنا پڑرہا تھا۔ یہ ناکہ بندی محض امریکہ اور اسرائیل کی خوشنودی کے لئے کی گئی تھی۔

امام نے کہا کہ ایران کی حکومت سائنس کو فروغ دینے کے لئے کوشاں ہے۔

جہاں تک سائنس کا سوال ہے تو میں نے انقلاب ہوٹل کے ریسپشن ہال میں تہران ٹائمز میں پڑھا کہ ایران نے مقامی تکنالوجی سے نیوکلیائی آبدوز بنائی ہے۔ ایک اور سائنسی خبر یہ پڑھی کہ ایرانی سائنس داں مواصلاتی سیارے کے ذریعہ جاندار جرثومے خلا میں بھیج رہے ہیں اور اس کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

امام خامنہ ای نے شیعہ سنی اتحاد پر زور دیا اور کہا کہ اگر دونوں میں اتحاد ہو تو کوئی انہیں زک نہیں پہنچا سکتا۔

امام خامنہ ای کی تقریر کے مختصر وقفوں کے دوران ہزاروں ہاتھ ایک ساتھ فضا میں بلند ہوتے تھے اور امریکہ اور اسرائیل کے خلاف نعرے بلند کئے جاتے تھے۔

جلسے میں صدر احمدی نژاد صدر رفسنجانی اور ایرانی پارلیمنٹ کے اسپیکر موجود تھے۔ اختتام پر پولیس کے کئی ہیلی کاپٹروں نے پرواز کئے۔

اس سفر کے دوران میں نے امام خمینی کو بہتر طور پر سمجھا۔ ایرانیوں کو امام خمینی سے عقیدت ہی نہیں ہے بلکہ وہ ان کی ہدایات پر عمل پیرا بھی ہیں۔ امام خمینی ۱۲ فروری ۱۹۷۹ء کو جب واپس لوٹے تو لاکھوں لوگوں نے والہانہ طور پر امام کا استقبال کیا۔ یکم اپریل ۱۹۷۹ء کو ملک میں ریفرنڈم ہوا کہ آیا ایران کو اسلامی جمہوریہ بنایا جائے یا نہ بنایا جائے۔ ۹۸ اعشاریہ ۲ فیصد رائے دہندگان نے ایران کو اسلامی جمہوریہ بنائے جانے کے حق میں ووٹ ڈالے۔ اس استصواب رائے عامہ میں دو کروڑ ۲۸ لاکھ سے زائد ایرانیوں نے حصہ لیا تھا۔ یہ امام کی تمنا اور موقف کے عین مطابق تھا۔ لوگ آج بھی

اسی موقف پر قائم ہیں۔

میں ۱۹۹۵ء میں اسلام آباد میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ پاکستان میں محمد علی جناح کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ لیکن پاکستان کے لئے ان کی سیاسی بصیرت کے مطابق جو Vision تھا، پاکستان کے لوگ اس سے بہت ہٹ گئے ہیں۔ ۲۰۰۷ء میں استنبول گیا۔ ترکی کے لوگ مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں اور انہیں اتاترک یا ترکوں کا باپ کہتے ہیں۔ میرے ایک میزبان نذیر احمد ڈول نے مجھے کہا کہ ترکی میں لوگ اتاترک مخالف باتوں سے برافروختہ ہوتے ہیں۔ یہ اتاترک ہی تھے جنہوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران ترکی کی سالمیت اور حاکمیت کو برقرار رکھا اور جدید ترکی کی بنیاد ڈالی۔ لیکن مصطفیٰ کمال پاشا نے مذہب مخالف جو چند اقدام کئے ترکی کے لوگوں نے جلد یا بدیر انہیں قبول نہیں کیا۔ چنانچہ ترکی میں دوبارہ اسلام زندہ ہوا ہے۔

ہمارے اپنے ملک میں مہاتما گاندھی کا مقام ایک رہنما اور تحریک آزادی کے پیش روکی حیثیت سے سب سے اونچا ہے۔ انہیں پیار اور عقیدت سے باپو کہتے ہیں لیکن گاندھی جی کے بنیادی فلسفہ کو لوگوں نے پس پشت ڈالا ہوا ہے۔

اس کے برعکس امام خمینی کے فلسفہ پر ایران کے لوگ آج بھی عمل پیرا ہیں۔ امام خمینی کے انتقال کے بعد جرمنی کے جریدہ Spiegel نے لکھا:

''امام خمینی نے اپنے دور میں انقلاب لایا۔ انہوں نے مراکو سے انڈونیشیا تک مسلمانوں کو ایک سیاسی قوت میں بدل دیا۔''

امام خمینی کا پیغام آفاقی ہے۔ انہوں نے مطلق العنانیت اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ انگلینڈ کے پروفیسر بر ڈولی شیکسپیئر نے لکھا ہے:

''امام خمینی کی تقریر ایران اور اسلام تک محدود نہیں تھی بلکہ ان کا روئے سخن ساری

انسانی برادری تھا۔"

۴رفروری ۱۹۷۸ء کو جنتا پارٹی کی حکومت کے زمانے میں رضا شاہ دہلی آئے تو ایران اور ہندوستانی طلبہ نے شاہ کے خلاف مشترکہ مظاہرہ کیا اور ہزاروں کالی جھنڈیاں دکھائیں۔ پولیس نے سینکڑوں ہندوستانی اور ۷۱ ایرانی طلبہ کو گرفتار کیا تھا۔ ۴ر جون کو ہم نے ہوٹل انقلاب کو خیر باد کہا۔ میزبان انتظامیہ نے ہرایک کو ایرانی مٹھائیوں کے دو ڈبے اور تین کیسٹ دئے۔ مہر آباد ہوائی اڈے سے ہم مشہد آئے۔ ہوٹل پہنچتے پہنچتے رات کے دو بج گئے۔ ہوٹل شہر کے مضافات میں ہے۔

مشہد ایران کا تاریخی شہر ہے۔ تہران کی طرح جدید اور صاف ستھرا شہر ہے۔ شہر کے مضافات میں وسیع سرسبز میدان اور پہاڑ ہیں۔

مشہد میں امام علی رضا کا روضہ ہے۔ جو مرجع خلائق اور زیارت گاہ خاص وعام ہے۔ امام علی رضا کے روضہ کا کمپلیکس بہت بڑا اور سنگ مرمر سے ڈھکا ہوا ہے۔ وسیع وعریض صحن میں لاکھوں لوگ نماز ادا کر سکتے ہیں۔ ایرانی حکومت کے مہمان کی حیثیت سے روضہ کے خوش پوش عملہ ارکان نے کئی جگہوں پر لوبان دانی اور گلاب پاشی سے ہمارا استقبال کیا۔ مہمانوں کے لئے ظہرانہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ مہمانوں اور زائرین کے لئے یہاں لنگر چلتا ہے۔

ایران میں سلاد اور جوس کھانے کے ضروری جزو ہیں۔ سلاد عموماً کھانے سے پہلے پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے روز پارشین انقلاب ہوٹل میں ہماری میز پر سلاد اور روٹیاں رکھی گئیں۔ میں اور جعفر نے اسی کو لنچ سمجھ کر کھایا۔ بعد میں پلاؤ آیا۔ مرغن کھانے کے مقابلے میں یہ زیادہ مقوی غذا ہے۔

دوسرے روز گرینڈ ہوٹل سے ہم مشہد ائیر پورٹ جانے کے لئے نکلے تو ہوٹل کی انتظامیہ نے ہر ایک کو قرآن مجید کی خطاطی اور خوش نویسی کی ایک ایک نادر کتاب دی،

جس میں حضرت علیؓ، حضرت امام حسینؓ، حضرت امام حسنؓ، امام سجاد، امام موسیٰ بن جعفر، امام رضا اور دوسرے ائمہ کی تحریروں سے منسوب قرآنی آیات اور مابعد زمانہ خوش نویسوں کی لکھی ہوئی قرآنی آیات بھی دی گئی تھیں۔

مشہد سے ایک چارٹرڈ ہوائی جہاز مہمانوں کو لے کر دوبارہ مہر آباد ہوائی اڈہ پر اترا۔ جہاں سے ماسوائے ہندوستانی مہمان سبھی کو ہوٹل پرشین انقلاب ہوٹل، استقلال اور دوسرے ہوٹل لے گئے۔ انہیں ایک دن بعد اپنے اپنے ملکوں کو لوٹنا تھا۔ بس میں ہمیں امام خمینی بین الاقوامی ہوائی مستقر لے جایا گیا۔ ہوائی اڈہ کی ڈیوڑھی پر ایرانی حکومت کے ایک اہلکار نے ہمیں الوادع کیا۔ میں شاید آخری مسافر تھا۔ وہ مجھ سے بغل گیر ہوا۔

ہم نے ایران کے لوگوں کو عمومی طور پر ملنسار اور مرنجاں مرنج پایا۔ ٹی این کول نے لکھا ہے: ''دنیا میں کہیں بھی مجھے ایسے دوست اور مہذب لوگ نہیں ملے۔''

فرانس کے ایک معروف سیاح Chardin نے یہاں تک کہا ہے کہ ایرانی مشرق میں مہذب ترین لوگ ہیں۔ وہ شاہ عباس کے دور حکومت میں سولہویں صدی میں ایران کی سیاحت پر آیا تھا۔

ایران کے لوگ عمومی طور پر خوش حال ہیں۔ ہم نے قم، مشہد اور تہران میں ماسوائے ایک کوئی بھکاری نہیں دیکھا۔ ایک دن تہران کے ایک بازار میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت کو راہ گیروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے دیکھا۔

تہران ایئرپورٹ پر ہندوستانی کرنسی کا ایرانی ریال سے تبادلہ ہوتا ہے۔ ہم میں سے بعض لوگوں نے ایئرپورٹ پر خشک پھل وغیرہ خریدے۔

ہم ایک دفعہ پھر ماہان ایئر لائنز میں ایران کی یادیں لے کر دہلی لوٹے۔

☆☆☆

شعروادب

فیض احمد فیضؔ

ایک انسان دوست شاعر

عبدالغنی شیخ

فیض احمد فیضؔ دورِ حاضرہ کے ایک عظیم شاعر اور دانشور تھے۔ ایک صحافی، ٹریڈ یونین لیڈر اور ثقافتی اداروں کے بانی کی حیثیت سے مختلف شعبوں میں انہوں نے اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔

فیض احمد فیضؔ بہت پڑھے لکھے شاعر تھے۔ عالمی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ سائنس، فلسفہ، تاریخ نفسیات، سیاسیات اور مذہب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انگریزی اور عربی پر عبور تھا۔ اور قرآن اور حدیث کا گہرا علم رکھتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی کے مطابق بعض نجی صحبتوں میں وہ اپنے موقف کی تائید میں قرآن کی آیات اور احادیث بے تکان سنا دیتے تھے۔

فیض احمد فیضؔ نے ایک فعال زندگی گزاری وہ ایک ہی ڈگر کی زندگی سے بوریت محسوس کرتے تھے۔ بی بی سی کو ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہر پانچ یا چھ سال کے بعد انسان کو اپنا کام بدل لینا چاہیئے۔ جیسے ہم نے پہلے پانچ سال پڑھایا۔ پھر پانچ سال فوج کی نوکری کی۔ پھر اس کے بعد پانچ یا چھ سال صحافت کی نذر کر دئے۔ اس کے بعد پانچ سال جیل خانے میں گزارا پانچ چھ سال باہر گزارے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آدمی کو کسی ایک رٹ میں نہیں لگا رہنا چاہیئے۔

فیضؔ کو لڑکپن میں کرکٹ کا شوق تھا اور ایک اچھا کھلاڑی بننے کی امنگ تھی۔ وہ روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' اور روزنامہ ''امروز'' کے مدیر اعلیٰ رہے اور ہفت روزہ لیل ونہار ماہنامہ ''ادب لطیف'' اور افروایشیائی رائٹرز فیڈ ریشن کے جریدہ لوٹس کی بھی ادارت کی۔

وہ پاکستان کی ٹریڈیونین فیڈریشن کے نائب صدر اور محکمہ ڈاک وتار اور ریلوے کے کرمچاریوں کی یونین کے سربراہ بھی رہے۔ ان کے حقوق کے لئے جدوجہد کی اور ان کی لڑائی میں شریک کار رہے۔

ایک صحافی اور ٹریڈیونین لیڈر عبدالقدیر رشکؔ لکھتا ہے۔

''فیضؔ صاحب کے زورِ قلم نے ایسا رنگ باندھا کہ مزدوروں کے خلاف پولیس ایکشن کا ظلم ٹوٹ گیا۔ تب وہ ''پاکستان ٹائمز'' کے چیف ایڈیٹر تھے۔ مزدور لاہور کی ایک فیکٹری میں کام کرتے تھے اور رشکؔ کی قیادت میں اپنے حقوق کے حصول کے لئے میدان میں آئے تھے۔''

اپنے سیاسی نظریات کے لئے وہ کئی مرتبہ جیل گئے۔ دنیا کے قلم کار قیدیوں کی طرح انہوں نے جیل کی چار دیواری میں اُن کے اپنے الفاظ میں پرورش لوح وقلم کرتے رہے۔

ان کے ایک مداح سوم انند نے لکھا ہے۔

''سیاسی اعتبار سے انہوں نے دنیا کے مجبور، محکوم اور مظلوم لوگوں کے حق میں آواز اٹھائی۔ اچھا ہوتا اگر وہ سودیت یونین کے ان ادیبوں کے حق میں بھی کچھ کہتے جو کمیونسٹ حکومت کے عتاب کا شکار بنتے رہے ہیں۔ درحقیقت ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ سیاسی اور نظریاتی طور پر یہ ایک تنگ دائرے میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے میں سمجھتا ہوں کہ فیض صاحب اگر سوویت یونین میں ادیبوں کے لئے

آزادیٔ تحریر کے حق میں کچھ لکھتے تو ان کے وقار اور مرتبے میں اور اضافہ ہوتا۔"

سوم آنند لاہور میں ان کا ایک ہم عصر ادیب تھا۔

ژاں پال سارترے، برٹرینڈ رسل اور البرٹ کیمو مارکسزم کے حامی اور بائیں بازو کے نظریات کے حامی تھے لیکن روس میں ظلم و ستم کے واقعات کے بعد انہوں نے اشتراکیت کو خیر باد کہا۔ سارتر نے The Dirty Hand میں سٹالن کے دور حکومت کے مظالم کو اجاگر کیا ہے۔

فیضؔ احمد فیضؔ آخری دم تک اشتراکی رہے۔ تاہم پاکستانی قلم کار مجیب الرحمٰن شامی رقم طراز ہے۔

فیضؔ اشتراکی تھے۔ ویسے اشتراکی نہیں جیسے روس یا کسی اور ملک میں پائے جاتے ہیں۔ وہ پاکستان کی ثقافت اور دینی اقدار سے اپنے آپ کو الگ نہ کر سکے۔ ان سے کسی نے سوال کیا کہ کسی ایسے شخص کا نام لیجئے کہ بے اختیار زندہ باد کہنے کو دل چاہے تو انہوں نے پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کا اسم مبارک لیا۔

فیضؔ نے کم عمری میں شاعری کی اور شہرت حاصل کی۔ نومبر ۱۹۲۸ء میں لاہور کے گورنمنٹ کالج کے ایک مشاعرہ میں انہوں نے غزل پڑھی اور اس شعر پر بڑی داد ملی۔

لب بند ہیں ساقی میری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کش صہبا نہیں ہوتا

تب وہ سولہ برس کے تھے۔ مشاعرہ میں اردو کے نامور مزاح نگار پطرس بخاری موجود تھے۔ انہوں نے تاڑ لیا کہ یہ ہونہار لڑکا آگے جا کے اپنا نام پیدا کرے گا۔ بالکل اسی انداز میں نوجوان علامہ اقبالؔ نے لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں اپنا کلام سنایا تھا اور اس شعر پر "مخزن" کے مدیر سر عبدالقادر اور دوسرے کئی

مشق استادوں نے داد دی تھی۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

فیضؔ نے آٹھویں جماعت میں اپنے ہم جماعت طالب علم چھجورام پر ہجو لکھی تھی۔ جس میں اس کے سر، پیر اور ٹانگوں کا مضحکہ اڑایا گیا تھا۔ یہ نظم سارے سکول میں مشہور ہوئی۔ فیضؔ چھجورام سے معافی مانگنے گئے۔ چھجورام بولا۔ معافی کیسی ! میں تو شکرگزار ہوں کہ تم نے مجھے سارے سکول میں مشہور کر دیا۔

فیض احمد فیضؔ نے نسبتاً کم عمری میں بہت اچھی نظمیں کہی ہیں۔ نقش فریادی ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ تب فیض ۲۹ سال کے تھے۔ اس مجموعے میں فیض کی کئی مشہور نظمیں اور غزلیں ہیں۔ جیسے

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے
وہ جارہا ہے کوئی شب غم گزار کے
چند روز او مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
مری جان اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو
ابھی تک دل میں تیرے عشق کی قندیل روشن ہے

سوم آنند نے لکھا ہے۔

لاہور میں خاص طور پر ان کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' زبان زد تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ساحر لدھیانوی کی کتاب ''تلخیاں'' کا پہلا ایڈیشن چھپا اور یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں ان کی نظم ''تاج محل'' کے تراشے جیبوں میں لئے پھرتے تھے۔ مقدمہ سازش راولپنڈی کے سلسلے میں فیض احمد فیضؔ گرفتار ہوئے۔ تین ماہ قید تنہائی میں رکھنے کے بعد فیضؔ کو دوسرے قیدیوں کے ساتھ حیدر آباد جیل منتقل کیا گیا۔ قیدیوں میں زیادہ تر فوجی افسران تھے۔ جیل میں یہ گاہے گاہے مشاعرے منعقد کرتے تھے۔ جن میں فیضؔ اور سجاد ظہیر کے علاوہ دوسرے قیدی بھی مشق سخن کرتے اور اپنا کلام سناتے تھے۔ میجر جرنیل اکبر خان کا تخلص فتوریؔ، میجر جرنیل نذیر احمد کا سارسؔ، ائیر کمانڈر محمد خان جنجوعہ کا پٹاخہؔ، بریگیڈر لطیف خان کا خبطیؔ، لیفٹیننٹ کرنل ضیاء الدین کا گڑبڑؔ، میجر حسن خان کا جاہلؔ، کپتان خضر حیات کا پٹیوؔ، لیفٹیننٹ کرنل نیاز محمد ارباب کا شرؔ، فیض احمد فیضؔ کا کاہلؔ اور سجاد ظہیر کا لاغرؔ اور راوی اور مضمون نگار کپتان ظفر اللہ پوشنی کا خبیثؔ تھا

ظفر اللہ پوشنی نے اپنے مضمون میں ۱۹/ اگست ۱۹۵۲ء کو جیل خانے میں میجر جرنیل نذیر احمد کی صدارت میں منعقدہ ایک طرحی مشاعرے کے حوالے سے لکھا ہے کہ داد کم اور فقرے زیادہ کسے جاتے تھے۔ البتہ فیض کے کلام کو سنجیدگی سے سنتے تھے۔ اس روز فیض احمد فیضؔ نے اپنی ایک مشہور غزل سنائی۔ جس کے چند بند پیش خدمت ہیں۔

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
دوستو اس چشم ولب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستان کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

اس مشاعرے میں فیضؔ سمیت چھ قیدیوں نے اپنا کلام سنایا۔ فیض تو فیضؔ اور دوسرے نو آموز شعرا نے اس طرحی مشاعرے میں لگ بھگ ایک ہی وزن کے پھڑکتے ہوئے اشعار سنائے۔

میجر حسن خان جاہل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

چھوڑ دینا ہم سے سیکھو عین مستی میں شراب
بھول کر بھی اب نہیں لیتے ہیں میخانے کا نام

لیفٹینینٹ کرنل نیاز محمد ارباب شرؔ کا ایک شعر:

کون لیتا ہے جہاں میں آج فرزانے کا نام
اب تو بس مشہور ہے بھینگے یا کانے کا نام

پوشنی کے مطابق روئے سخن غالباً استغاثہ کے سب سے بڑے وکیل مسٹر بروہی کی طرف تھا جس کی آنکھوں میں کچھ نقص تھا۔

شرؔ کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

حامئی جبر وتشدد ہوگئے ہیں اہل حکم
چھا رہا ہے آج سارے دیس پر تھانے کا نام

دوسرے مصرع طرح کا ایک شعر پیش ہے، جسے محمد حسین عطا نے پیش کیا۔

چمن کے گوشے گوشے میں خزاں کی حکمرانی ہے
گلوں کا رنگ پھیکا ہے فزوں دردِ نہانی ہے

کیا کیا؟ کہاں درد ہے؟ ایک صاحب جو اونگھ رہے تھے یکا یک چونک کر بولے آخر میں صاحب صدر اعلان کرتا ہے۔ اب آپ کو حضرت خبیثؔ اپنا کلام سنائیں

گے۔میجر حسن نے لقمہ دیا۔ان کی خباثت اور شوخی سے کون انکار کرسکتا ہے!۔

پوشنی کے دو اشعار:

ہائے اس گورے بدن کے پیارے پیارے پیچ وخم
ساعتِ دیوار ہے، چولی مسک جانے کا نام
سامنے غیروں کے تم ہم سے کردے بے شک حجاب
پر اکیلے میں نہ کیجیو دوست شرمانے کا نام

اس شعر پر مکرّر مکرّر کا شور بلند ہوا۔

پوشنی لکھتا ہے۔فیضؔ جیل میں وقتاً فو قتاً شعر کہتے رہے تھے اور جب بھی کوئی غزل یا نظم مکمل ہو جاتی۔وہ چپکے سے کہہ دیتے کہ بھئی کچھ سننا ہے تو آجاؤ میرے کمرے میں ۔اس پر چاروں طرف ایک شور مچ جاتا کہ فیضؔ نے نئی چیز کہہ لی ہے۔جلدی اس کے کمرے میں پہنچو۔بس پھر کیا تھا۔یار لوگ سب کام کاج چھوڑ کر سیدھے ان کی کھولی میں پہنچتے ۔جب پوری قوم جمع ہو جاتی تو فیضؔ حسبِ معمول نہایت مدھم آواز میں اپنا کلام سنانے لگتے اور ہم لوگ ہر شعر پر دل کھول کر داد دیتے......فیضؔ کے لکھے ترانے ''دربار وطن میں جب ایک دن سب جانے والے جائیں گے۔کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے کچھ اپنی جزا لے جائیں گے'' اکھٹے گاتے تھے۔

پوشنی لکھتا ہے۔ہم میں مختلف خیالات کے لوگ موجود تھے۔تاہم اس کے خیال میں ہر شخص اس گیت کو گاتے وقت اپنے آپ میں ایک نیا ولولہ، ایک نیا جوش اور ایک نئی امنگ محسوس کرتا تھا۔ایسی والہانہ امنگ جسے زنداں کی اونچی دیواریں اور آہنی سلاخیں بھی دبانے میں کامیاب نہیں ہوسکتی تھیں۔

اس ترانے کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

اے خاک نشینو! اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے جب تخت گرائے جائیں گے

جب تاج اچھالے جائیں گے

فیضؔ کے اشعار سے انہیں امید اور حوصلہ ملتا تھا۔

فیض احمد فیضؔ کے متعدد معرکتہ الآرا اشعار ان کے قید و بند کے ایام کی دین ہیں۔ جیسے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے
نثار میں تیری گلیوں پرائے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

مذکورہ ترانہ جیل میں پڑھے گئے اشعار اور اوپر کے اشعار ''دست صبا'' میں ہیں۔ یہ جیل کی آہنی سلاخیں پھاند کر باہر پہنچتے تھے۔ دسمبر ۱۹۵۲ء میں جیل میں یہ خبر آئی کہ ''دستِ صبا'' شائع ہوگئی ہے۔ ادب سے دلچسپی رکھنے والے تمام قیدیوں کو بڑی مسرت ہوئی۔ جیل کے حکام سے اجازت لے کر ایک پارٹی ہوئی اور فیض کو ''دستِ صبا'' کی اشاعت پر مبارک باد دی گئی۔

فیضؔ نے اپنی اہلیہ ایلس کو جیل خانے سے ایک خط لکھا 'دستِ صبا' کا مجموعہ تمہارا ہے۔

فیض نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

اگر اپنے دل میں جرم و گناہ کا کوئی احساس نہ ہو تو آدمی عذاب اور دکھ درد، سب مفارقتیں، سب سختیاں، اور صعوبتیں غرض وہ برداشت کرسکتا ہے جو باہر سے اس کی ذات پر نازل ہوں۔

غالباً یہ فیضؔ نے اپنے زمانہ زنداں کے تناظر میں لکھا ہے۔

شعر و شاعری سے متعلق فیض نے وقتاً فوقتاً جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان سے

ان کواوران کے کلام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔لندن میں ان کے اعزاز میں منعقدہ ایک سمینار میں فیض نے کہا۔سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ شاعر کے پاس کہنے کے لئے کچھ ہونا چاہئے۔لیکن کہنے کے لئے کچھ ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ کہنے کا سلیقہ بھی ضروری ہے۔

دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں:

جو کچھ لکھو اپنے دل سے لکھو۔کسی کے کہنے پر نہیں لکھو۔دباؤ میں آکر نہیں لکھو۔ ثواب اور سیاست کی خاطر نہیں لکھو۔

ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

شاعر،ادیب اور دانشور کو بنیادی طور پر آگاہی ہونی چاہئے کہ سچ کیا ہے؟ جھوٹ کیا ہے؟ عارضی کیا ہے؟ مستقل کیا ہے؟ حقیقت کیا ہے؟

فیض احمد فیضؔ نے اپنا پیام سلیقے سے دیا ہے۔نعرہ بازی سے کام نہیں لیا ہے۔اور پروپیگنڈے کا سہارا نہیں لیا ہے۔گوپی چند نارنگ نے کیا خوب کہا ہے۔

فیضؔ نے اپنی انقلابی فکر کے اظہار کے لئے غنائیت کو اور غنایت کے اظہار کے اظہار کے لئے انقلابیت کو قربان نہیں کیا۔

مجروحؔ سلطان پوری نے اسی بات کو ان لفاظ میں کہا ہے:

فیضؔ انقلابی شاعر تھے مگر ان کے یہاں انقلابی نعرہ بازی نہیں۔ان کا لہجہ لیڈرانہ نہیں،عاشقانہ تھا۔وہ ترقی پسندوں کے میر تقی میرؔ تھے۔

فیض احمد فیضؔ سرمایہ داری، جاگیرداری اور سامراجیت کے خلاف تھے۔لیکن ان کی زندگی بائیں بازو کے ایک پرولتاری کا نمونہ نہیں تھی۔ وہ اچھا کھاتے تھے،اچھا پہنتے تھے اور اچھی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ ان کا جمالیاتی ذوق تھا کہ انہوں نے اپنی قیدوبند کے دوران منٹگمری جیل میں پھول اگائے۔جیل کے احاطے میں ایک پھلواری

بنی تھی جو پورے جیل خانے میں پھیل گئی۔ وہ پھولوں کے بیج اہل خانہ کی وساطت سے لندن سے منگاتے تھے۔

فیض بہت کم گو، کم آمیز اور منکسر المزاج تھے بقول ایک واقف کار، وہ کسی کی برائی اور غیبت نہیں سنتے تھے۔ ان کی تحریروں سے ان کی حلیمی اور انکساری کا اظہار ہوتا ہے۔ اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ انسانی رنج اور ناخوشی کی بنیاد دراصل اپنی خود پسندی ہے۔ یعنی اپنی ذات سے بہت زیادہ وابستہ کرنا۔

دوسرے خط میں وہ لکھتے ہیں: اپنی صلاحیت تو بہت محدود ہے اور بہت سے لوگ مجھ سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ بات صرف محنت اور عرق ریزی کی ہے۔

۱۹۷۶ء میں لندن میں ان کی سالگرہ پر اپنے بارے میں باتیں کرنے کی انہیں دعوت دی گئی۔ تو وہ بولے۔ اپنے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے اور وحشت اس لئے بھی ہوتی ہے کہ دنیا کے جتنے بور لوگ ہیں ان کا سب سے محبوب مشغلہ یہی ہے کہ وہ اپنے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔

اپنی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

کچھ عرصہ بعد انسان اپنی ذات کو مرکز دو عالم سمجھنا چھوڑ دیتا ہے۔ اور اسے عالمگیر ظلم اور بے انصافی کے پیش نظر اپنی ذرا ذرا سی ناکامیاں بے حقیقت دکھائی دینے لگتی ہیں۔

فیضؔ اپنے نظریات کے خول میں مقید نہیں تھے وہ دوسرے نظریات کے روادار تھے۔

ایک خط میں لکھا ہے۔ تمام ادب خواہ وہ کسی سیاسی نظریئے، کسی مکتب فکر یا کسی شخص سے متعلق ہو۔ بہر صورت قومی اثاثے کا جزو ہے۔ اس لئے حالات کچھ بھی ہوں۔ ادب کی تخلیق بہر صورت ایک قومی خدمت کی ادائیگی ہے۔

علامہ اقبال سے ان کی ملاقات تھی اور ان کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اقبال سے نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ لکھتے ہیں:

علامہ اقبالؔ ایسا ہے کہ اسے پڑھتے وقت کوئی اور نظر میں نہیں جچتا۔ محسوس ہوتا ہے جیسے شاعری وہ ہیں۔ فکر اور شعریت دونوں میں ہیں۔ ہمہ گیر اور آفاقی۔

فیضؔ نے غالبؔ اور میرؔ کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے جوشؔ اور فراقؔ پر بھی مضامین لکھے ہیں۔

فیض احمد فیضؔ ایک بڑے ادیب ہی نہیں تھے۔ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ وہ ایک اچھے اور شفیق باپ تھے۔ ان کی بیگم ایلس نے کہا ہے۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ فیضؔ کی کونسی بات مجھے اچھی لگی تو میں کہتی ہوں۔ ان کی ہر ادا مجھے دل سے پسند تھی۔ بعض دوستوں نے بیگم فیضؔ سے یہ سوال کیا تھا کہ انہوں نے کبھی فیضؔ کو غصے کے عالم میں دیکھا تو ان کا یہ جواب تھا۔ 'گھریلو زندگی میں انہوں نے کسی آبگینے کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔'

ان کی شادی بھی قدرے ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ مس ایلس انگلستان سے اپنی بڑی بہن سے ملنے امرتسر آتی تھیں۔ جن کی شادی ڈاکٹر محمد الدین تاثیر سے ہوئی تھی۔ جو بعد میں سرینگر میں ایس۔ پی۔ کالج کے پرنسپل رہے۔ فیضؔ امرتسر کے ایم۔ او کالج میں لیکچرار تھے۔ یہاں ایلس کی فیضؔ سے ملاقات ہوئی۔ بقول ایلس 'فیضؔ مجھے پہلی نظر میں اچھے لگے۔'

فیضؔ نے اپنے گھر والوں سے کہا تھا کہ وہ ایلس کے بغیر کسی سے شادی نہیں کریں گے۔ ایلس نے کہا تھا۔ 'میں برقع کے بغیر ہر لباس پہنوں گی۔' ان دنوں مسلمانوں کے سماج میں برقع عام تھا۔

فیضؔ اور ایلس کا نکاح شیخ محمد عبداللہ نے سرینگر میں پڑھا تھا۔

ان کی بڑی بیٹی سلمیٰ ہاشمی لکھتی ہیں کہ باپ سے زیادہ وہ ان کے دوست تھے۔ دوسری بیٹی منیرہ کہتی ہیں۔ 'میرے والد کے جسم و جان میں، میرے خیال میں خون کے

بجائے محبت کا پیار کا، دریا ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ وہ کہتے تھے جتنا لوگوں کو پیار کرو گے، وہ اس سے بڑھ کر تمہیں پیار کریں گے۔'

سیالکوٹ کالج میں ان کے استاد محمد سلیم چشتی نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں پیش کیے ہیں۔ 'یہ لڑکا اپنی شرافت، سنجیدگی، بردباری، کم آمیزی اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے میری ساری کلاس میں ممتاز تھا۔'

ایک انٹرویو میں فیض نے کہا ہے: 'میں اگر کسی سے ناراض ہوتا ہوں تو میں سو جاتا ہوں۔'

اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

یہ بات خاص طور سے یاد آتی ہے کہ ہمارے گھر میں خواتین کا ایک ہجوم تھا؟ تین بھائی تھے۔ ان میں ہمارے چھوٹے بھائی (عنایت) اور بڑے بھائی (طفیل) خواتین سے باغی ہو کر کھیل کود میں مصروف رہتے تھے۔ ہم اکیلے ان خواتین کے ہاتھ آ گئے۔ اس کا کچھ نقصان بھی ہوا اور کچھ فائدہ بھی۔ فائدہ تو یہ ہوا کہ ان خواتین نے ہم کو انتہائی شریفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ جس کی وجہ سے کوئی غیر مہذب یا اجڈ قسم کی بات اس زمانے میں ہمارے منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ اب بھی نہیں نکلتی۔ نقصان یہ ہوا۔ جس کا مجھے اکثر افسوس ہوتا ہے کہ بچپن میں کھلنڈرے پن یا ایک طرح کے لہو ولعب کی زندگی گزارنے سے ہم محروم رہے۔ مثلاً یہ کہ گلی میں کوئی پتنگ اڑا رہا ہے، کوئی گولیاں کھیل رہا ہے۔ کوئی لٹو چلا رہا ہے۔ ہم بس کھیل کود دیکھتے رہتے اکیلے بیٹھ کر۔

تب فیضؔ ابا کو اخبار پڑھ کر سناتے تھے۔ دونوں بھائیوں سے فیض کی انگریزی بہتر تھی۔

یہاں فیضؔ کے والد سلطان محمد خان کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ وہ سیالکوٹ کے مشہور بیرسٹر تھے اور انگلستان میں افغانستان کے سفیر رہے۔ علامہ اقبالؔ

سر عبدالقادر اور سید سلیمان ندوی جیسی شخصیات سے ان کے تعلقات تھے۔ ان کی صحبت سے علم و ادب سے ان کا لگاؤ بڑھا تھا۔ انگریزوں نے انہیں خان بہادر کا خطاب دیا تھا۔ کسی نے جب ان سے یہ کہا کہ آپ تحریک آزادی میں حصہ لیں تو انہوں نے جواب دیا کہ ان کے بچے ابھی چھوٹے ہیں۔

یہی سلطان محمد خان پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں کالا قادر کے سب سے مفلس اور نادار کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی روئیداد فیضؔ کی زبانی سنئے۔

جب ابا پانچ برس کے ہوئے تو غربا کی روایت کے مطابق انہیں پڑھنے کے بجائے روٹی کمانے کا فن سکھایا گیا۔ دیہات والوں نے ہمارے ابا کو مویشی چرانے پر لگا دیا...... ابا صبح سویرے ریوڑ لے کر دیہات سے باہر چلے جاتے۔ گلہ بانی کرتے۔ مویشی گھاس چرتے اور یہ کسی درخت کے سائے میں بیٹھے دور اسکول اور اس میں طلباء کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے...... پھر ایک ماسٹر کی مہربانی سے اسکول میں جا کر سبق لینے لگے اور مویشی چراتے ہوئے سبق یاد کرتے تھے۔ اس طرح انہوں نے پرائمری اور مڈل کے امتحان پاس کیے...... ہائی سکول کی تعلیم کے لئے وہ لاہور میں موچی دروازے کی ایک مسجد میں جا کر رہنے لگے...... اب والد صاحب دن میں سکول جاتے۔ دوپہر اور شام مسجد کا کام کرتے۔ کھانا محلے سے آجاتا اور پھر عشا کی نماز کے بعد لاہور ریلوے سٹیشن چلے جاتے۔ وہ رات گئے تک قلی گیری کرتے۔ اس طرح جو رقم جمع ہوتی۔ وہ اپنے گھر والوں کو بھیج دیتے۔

فیضؔ پر اپنے باپ کا اثر رہا۔ اور اپنے کو محنت کش انسانوں کی جدوجہد اور مقدر سے وابستہ کیا۔ بعد میں فیض جب امرتسر ایم۔او۔ کالج میں لیکچرار تھے، اردو کی پہلی خاتون افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر رشید جہاں نے فیضؔ کو کھویا کھویا سا پایا۔ پوچھا۔ معاملہ کیا ہے؟ کسی کام میں تیرا جی نہیں لگتا۔

فیضؔ جواب دینے میں ہچکچائے۔تو وہ بے تکلف بولیں۔'محبت میں ناکامی !'
فیضؔ نے اثبات میں سر ہلایا۔

یہ شاید وہی رومان ہوگا، جس کا ذکر سعادت حسن منٹو نے کیا ہے۔منٹو تب امرتسر کالج میں پڑھتے تھے۔وہ فیضؔ کا پیغام ان کی محبوبہ تک پہنچاتے تھے۔جس کا گھر ایک پہاڑی پر تھا بعد میں فیضؔ کو جب ایک دوست نے اس حوالے سے سوال کیا تو وہ یہ کہہ کر ٹال گئے۔'بھئی وہ پرانی باتیں ہیں۔'

ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا ہے۔تب ڈاکٹر رشید جہاں فیضؔ سے بولیں۔
''حادثہ تمہاری ذاتِ واحد کا بہت بڑا ہو سکتا ہے۔مگر یہ اتنا بڑا بھی نہیں کہ زندگی بے معنی ہو جائے۔''

انہوں نے فیضؔ کو ایک کتاب مطالعہ کے لئے دی اور پھر ملنے کے لئے کہا۔یہ کتاب کارل مارکس کی کمیونسٹ مینی فیسٹو تھی۔فیضؔ نے کتاب پڑھی اور ان پر چودہ طبق روشن ہوئے بقول ڈاکٹر قمر رئیس: اور پھر فیضؔ پکار اٹھے۔

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

آگے وہ لکھتے ہیں: 'اب فیضؔ کئی منزلوں کا مسافر بن گیا۔'

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیضؔ کو بچپن میں کہانیاں سننے کا بڑا شوق تھا۔فیضؔ کی بڑی بہن بی بی گل بتاتی ہیں۔ان کی پرورش میں نانا جان، سردار جان کا بہت حصہ تھا۔انہیں بہت سی کہانیاں یاد تھیں۔فیضؔ بڑے چاؤ سے کہانیاں سنتے تھے۔

آگے وہ لکھتی ہیں۔گھر میں مذہب کا بڑا زور تھا۔نماز باقاعدگی سے پڑھی جاتی تھی۔پورے روزے رکھے جاتے تھے۔کلامِ پاک کی تلاوت باقاعدگی سے ہوتی تھی۔

فیضؔ نے خود لکھا ہے کہ انہوں نے تین سیپارے حفظ کیے تھے۔

بچپن میں ایسا ہی ماحول سردار جعفری، سجاد ظہیر اور کئی دوسرے ترقی پسند ادیبوں کو ملا۔ آگے جا کر ان کی طرح فیضؔ بھی مذہبی ارکان سے بیگانہ رہے۔

اقبال تاجر نے لکھا ہے۔ فیض صاحب بعض مکروہات کے عادی ہو گئے تھے۔ مگر وہ اپنی ان بعض عادات کو واضح طور ناپسندیدہ قرار دیتے تھے۔ شاید یہ ان کے ناؤنوش کی طرف اشارہ تھا۔ بقول اقبال تاجر انہیں مذہبی اشعار سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ مگر وہ منکرِ اسلام نہیں تھے۔ وہ اسلام کی ایک تعبیر اور تفسیر رکھتے تھے۔ اقبال، ایک کالم نویس عبدالقادر حسن کے حوالے سے لکھتا ہے کہ فیضؔ نے ان کے گاؤں میں ایک مسجد بنوائی تھی۔ فیضؔ اس کی مرمت کے لئے کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے تھے۔ انتقال سے چند روز پہلے وہ اپنے گاؤں گئے۔ مغرب کی نماز ہونے والی تھی۔ فیضؔ نے امامِ مسجد سے امامت کرنے کی اجازت چاہی۔ امام مسجد نے مگر حیرانگی سے اجازت دے دی۔ فیضؔ نے امام کے فرائض سرانجام دیئے۔ تاجر رقم طراز ہے۔ اس واقعہ نے بہت سے لوگوں کی غلط فہمی دور کردی۔ فیضؔ سے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ان کا کلام رومانیت اور حقیقت کا سنگم ہے۔ اور جذب کی آمیزش ہے۔ فیضؔ نے دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھا۔ شاعری کو اپنے دکھ درد سے آشنا کیا...... اور اردو کو ایک نیا لہجہ اور آہنگ بخشا۔ پاکستانی ادیب مشتاق احمد یوسفی نے فیضؔ کے انتقال کے دوسرے روز تعزیتی جلسے منعقدہ ۲۳/ نومبر ۱۹۸۴ء اپنے مضمون میں فیضؔ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

"آزادی، احترام آدمیت اور انسانی اقدار کی پاسداری جس پامردی اور استقامت سے انہوں نے کی۔ وہ لائق تحسین اور تکریم ہے...... انہوں نے بڑی بھرپور اور شاداب زندگی گزاری۔ وہ دنیا اور اہل دنیا سے کچھ لینے والے نہیں تھے۔ دینے والوں میں سے تھے...... فیضؔ اپنے عہد کی آواز نہیں، بلکہ ان کا عہد ان کی آواز بن گیا۔ ہم

کتنے خوش نصیب ہیں کہ ہم نے فیضؔ کو دیکھا۔

فیضؔ نے فلسطین کے مجاہدین اور تارک الوطن مرد عورتوں کے بارے میں فلسطینیوں کے کمپ میں ایک نظم سنائی تو سب کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

یاسیر عرفات نے فیضؔ کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

ہمارے عرب فلسطینی عوام آپ کی دوستی، آپ کے گہرے شعور اور فلسطین کے مسئلہ کے لئے نیز فلسطینی عوام کے جائز حقوق کے حصول کے لئے آپ کی جدوجہد پر فخر کرتے ہیں۔

آپ کے مخلصانہ اور سچائی سے بھرپور اشعار جن میں فلسطینی عوام کا ذکر ہے اور خاص طور پر اس کے بچوں کا اور اس کے انقلابیوں کا تذکرہ ہے، ابدالآباد تک ایک ایسا نمونہ پیش کریں گے جن سے برادرانہ صداقت اور مخلصانہ محبت اجاگر ہوتی رہے گی۔

فیض احمد فیضؔ اپنی حیات میں مشہور ہو گئے تھے۔ اس ضمن میں ان کی بیٹی منیرہ نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے:۔

ایک دفعہ ابا ہندوستان گئے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارے لئے وہاں سے کیا لاؤں۔ ان دنوں دلیپ کمار کا بہت دور دورہ تھا۔ میں نے کہا کہ آپ میرے لئے دلیپ کمار سے آٹو گراف لے آئیں۔ جب ابا واپس آئے تو آٹو گراف کے ضمن میں وہ بالکل چپ رہے۔ جب میں نے پوچھا، کیا ابا آپ دلیپ کمار کی آٹو گراف لائے تو کہنے لگے 'نہیں لی۔' میں نے کہا، کیا آپ کو دلیپ کمار نہیں ملا تو بولے ملا تھا۔ میں نے کہا تو آپ نے آٹو گراف کیوں نہیں لی۔ تو کچھ کھسائے بولے بیٹا اصل بات یہ ہے کہ وہ مجھ سے آٹو گراف مانگ رہا تھا۔

شاعری میں فیضؔ کا وہی مقام ہے جو بین الاقوامی شہرت کے شعراء ناظم حکمت، پبلو نرودا، نذرالاسلام، لوئیس اراگان اور نورڈا کو ملا ہے۔

فیضؔ کے تئیں احمد ندیم قاسمی کے تاثرات پر میں یہ مضمون ختم کرتا ہوں:

فیضؔ اپنا جتنا سرمایہ نسلوں کے سپرد کر گیا ہے وہ اتنا گراں بہا ہے کہ آئندہ صدیوں تک فیضؔ کے فن کی نو بہ نو توجیہات ہوتی رہیں گی۔ اور پڑھنے والے اس کے کلام کے مطالعے سے کچھ زیادہ ہی مہذب زیادہ منصف مزاج اور باطنی لحاظ سے زیادہ ہی خوبصورت ہوتے رہیں گے۔ فیضؔ کے صرف لہجے اور صرف زبان انداز بیان پر درجنوں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں...... فیضؔ نے پاکستان اور تیسری دنیا کو بلکہ پوری دنیا کو فن رجائیت اور انسان کے روشن مستقبل پر اعتماد کی صورت میں بہت کچھ دیا ہے۔

☆☆☆

سعادت حسن منٹو۔ چند تاثرات

عبدالغنی شیخ

۱۸/ جنوری ۱۹۵۵ء کے روز جب سعادت حسین منٹو ۴۳ سال کی عمر میں انتقال گئے تو کرشن چندر نے آکاش وانی دہلی سے ایک ریڈیائی تقریر میں کہا:

''منٹو کی موت پر آج جھنڈا سرنگوں نہیں ہوگا۔کوئی ماتم یا سوگ نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ کوئی منسٹر نہیں۔ منٹو ایک غریب ادیب ہے، تانگہ بانوں، نائیوں اور دھوبیوں کا..........''

پریم چند کے بعد کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسین منٹو اور عصمت چغتائی اس ترتیب کے ساتھ اردو کے چار بہترین افسانہ نگار نے جاتے رہے ہیں۔

منٹو نے تین سو کہانیاں، دوسو ڈرامے اور اتنے ہی مضامین، خاکے لکھے اور ترجمے کا کام کیا ہے جو بیس سے زائد کتابوں کو محیط ہیں۔آخری ایام میں وہ روزانہ ایک کہانی لکھنے لگے تھے۔ وہ اخبار کے کسی سنسنی خیز یا دلچسپ واقعہ پر بھی اپنی کہانی تعمیر کرتے تھے اور اکثر کہانیوں کا معاوضہ شراب میں جاتا تھا۔

زندگی میں سعادت حسن منٹو کی اتنی پذیرائی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیئے تھی۔ کسی رسالہ نے کوئی خصوصی شمارہ، کوئی گوشہ اور کوئی مفصل نقد و نظر شائع نہیں کیا۔ منٹو چاہتے تھے کہ کوئی رسالہ منٹو نمبر شائع کرے اور اس کو ایڈیٹ کریں۔ انتقال کے بعد ہندو

پاک کے مختلف رائل جیسے نقوش ،افکار، شاعر، پگڈنڈی ،دستاویز، روبی، منشور وغیرہ نے منٹو پر خصوصی شمار نکالے۔ کتابیں شائع ہوئیں۔ منٹو پر یادداشتیں چھپیں اور سبھی انہیں خراج عقیدت پیش کرنے لگے۔

یہ ستم ظریفی ہے کہ منٹو میٹرک میں تین بار اور ایف۔ اے میں دو بار ناکام ہوئے تھے۔ اسی منٹو کی کہانیاں کالج اور یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کی گئیں اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے ان کی نگارشات پر تحقیقی مقالے لکھے جانے لگے۔

انتقال کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں منٹو کی کتابیں ڈھڑا دھڑ چھپنے لگیں۔ اس ضمن میں مرحوم کی بیوی صفیہ سے کسی پبلشر نے پوچھا تک نہیں۔

فحش نگاری کے الزام میں منٹو پر کئی مقدمے چلے اور مشکلات پیش آئیں۔ کمزور مالی حالت اور تیز و تند نکتہ چینیوں اور اعتراضات کے باوجود وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آئے۔ ایک کہانی ''کھول دو'' شائع کرنے کی پاداش میں 'نقوش' کی اشاعت پر حکومت پاکستان نے چھ ماہ کی پابندی لگادی۔ جب ''بُو'' شائع ہوئی تو چند لوگوں نے معاملہ عدالت تک پہنچا۔ ایک ادیب نے منٹو سے کہا ''لاہور کے چند سرکردہ بھنگیوں نے ارباب عدالت سے شکایت کی ہے کہ آپ نے ایک افسانہ ''بو'' لکھا ہے، جس کی بدبو دور دور تک پھیل گئی ہے۔''

منٹو نے مسکراتے ہوئے کہا، ''کوئی بات نہیں۔ میں ایک افسانہ فینائل لکھ کر ان کی شکایت رفع کروں گا۔''

منٹو نے اپنے دفاع میں لکھا ہے۔

''کوئی مجھے گنجا فرشتہ کہتا ہے، تو کوئی شیطان ، میں اس حقیقت کو زمانے کے سامنے لانا چاہتا ہوں جو آج معاشرے میں وقوع پذیر ہو رہی ہے اور لوگ اسے پوشیدہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو اس سے ظاہر ہے کہ

ہم حقیقت کا سامنا کرنے سے کتراتے ہیں۔"

منٹو جب کچھ دن تک پاگل خانہ میں رہ کر باہر آئے تو ایار دوست مزاج پرسی کے ......اس کے پاس آئے۔ منتو نے بہت حسرت سے سب کو ایک ساتھ خطاب کرتے ہوئے کہا :

"بھائیو میں چھوٹے پاگل خانہ سے نکل کر بڑے پاگل خانہ میں آ گیا ہوں۔"

منٹو سے جب سوال کیا گیا کہ وہ کیوں لکھتے ہیں تو یہ جواب دیا:

"میں کیوں لکھتا ہوں؟ یہ ایسا سوال ہے جیسے کوئی پوچھے کہ میں کیوں کھاتا ہوں۔ کیوں پیتا ہوں؟ .... میں لکھتا ہوں اس لئے مجھے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ میں لکھتا ہوں اس لئے کہ میں کچھ کما سکوں تا کہ میں کچھ کہنے کے قابل ہو سکوں۔"

ایک جگہ منٹو نے اپنے مخصوص انداز میں صاف گوئی سے لکھتے ہیں:

"اگر یہ پوچھا جائے کہ میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں تو اس کا جواب حاضر ہے۔ میں اوّل تو اس لئے افسانہ لکھتا ہوں کہ مجھے شراب کی طرح افسانہ نگاری کی لت پڑ گئی ہے۔ میں افسانہ نہ لکھوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کپڑے نہیں پہنے یا میں نے غسل نہیں کیا یا میں نے شراب نہیں پی۔ میں افسانہ نہیں لکھتا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ افسانہ مجھے لکھتا ہے۔

"آپ کیسے لکھتے ہو؟" اس کا منٹو نے جواب دیا ہے۔

"......میں اپنے کمرے میں صوفہ پر بیٹھ جاتا ہوں، کاغذ قلم پکڑتا ہوں اور بسم اللہ کر کے افسانہ لکھنا سروع کرتا ہوں، میری تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں۔ میں ان سے باتیں بھی کرتا ہوں۔ ان کی باہم لڑائیوں کا فیصلہ بھی کرتا ہوں۔ اپنے لئے سلاد بھی تیار کرتا ہوں۔ کوئی ملنے والا آجائے تو اس کی خاطر داری بھی کرتا ہوں لیکن افسانہ لکھے جاتا ہوں۔"

آگے وہ لکھتے ہیں:

''میں ویسے ہی افسانہ لکھتا ہوں۔ جس طرح کھانا کھاتا ہوں، غسل کرتا ہوں ،سگریٹ پیتا ہوں اور جھک مارتا ہوں۔''

کبھی افسانہ نہیں بنتا۔ پیشگی دام لے چکا ہوتا ہے۔ ایسے میں منٹو لکھتے ہیں:

''سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا ہوں مگر افسانہ دماغ سے باہر نہیں نکلتا۔ آخر تھک ہار کر بانجھ عورت کی طرح لیٹ جاتا ہوں۔ ان لکھے افسانے کے دام پیشگی وصول کر چکا ہوں ،اس لئے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ کروٹیں بدلتا ہوں۔ اٹھ کر اپنی چڑیوں کو دانے ڈالتا ہوں۔ بچیوں کا جھولا جھلاتا ہوں۔ گھر کا کوڑا کرکٹ صاف کرتا ہوں۔ ننھے منے جوتے جو گھر میں جا بجا بکھرے ہوتے ہیں، اٹھا کر ایک جگہ رکھتا ہوں۔ مگر کم بخت افسانہ جو میری جیب میں پڑا ہوتا ہے میرے ذہن میں نہیں اترتا اور میں تلملاتا رہتا ہوں۔ جب بہت زیادہ کوفت ہوتی ہے تو باتھ روم میں چلا جاتا ہوں مگر وہاں بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

سعادت حسین منٹو حد سے زیادہ صاف گو تھے۔ اپنی تحریروں میں وہ کمزوریوں کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے عیوب گنتے ہیں۔ لیکن وہ دوسروں کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ ایسے میں وہ مجھے فرانس کے مفکر اور ادیب رُوسو کی طرح لگتے ہیں۔ خودنوشت سوانح حیات کے حوالے سے جارج برنارڈ شا رقم طراز ہیں:۔

''کوئی اپنے بارے میں سچی بات نہیں لکھتا۔''

لیکن منٹو منفرد تھے۔ صفیہ سے شادی کے ضمن وہ لکھتے ہیں:

''کوئی شریف آدمی مجھ جیسے قلاش اور مفلس کے ساتھ اپنی بیٹی کی زندگی وابستہ کرنے کے لئے کیسے تیار ہو سکتا ہے؟ میرے پاس تھا ہی کیا۔ انٹرنس پاس، وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں۔''

ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

''مجھ میں بحیثیت ایک انسان کے بے حد کمزوریاں ہیں۔اس لئے مجھے ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ یہ کمزوریاں دوسروں کے دل میں میرے متعلق نفرت پیدا کرنے کا موجب نہ ہوں۔''

دوسرے خط میں لکھا ہے:

''میں اپنی زندگی کا تین چوتھائی حصہ بد پرہیزیوں کی نذر کر چکا ہوں۔جب سے ہوش سنبھالا ہے پرہیز نہیں کیا۔اب تو یہ وقت آ گیا ہے کہ لفظ پرہیزی ہی میری ڈکشنری سے غائب ہو گیا ہے۔''

اس کا جواز اپنی منفرد افتادِ طبع کے مطابق یوں دیتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ زندگی اگر پرہیز سے گزاری جائے تو قید ہے۔اگر بد پرہیزی میں گزاری جائے تو بھی قید۔کسی نہ کسی طرح ہمیں اس ادنی جراب کے دھاگے کا ایک سرا پکڑ کر اسے ادھیڑتے جانا ہے اور بس!۔''

سعادت حسین منٹو اور اردو کے معروف خوش گو شاعر اسرار الحق مجاز میں گہری یکسانیت ہے۔دونوں اپنے اپنے میدانوں میں شاہسوار تھے۔دونوں کی شخصیت پُر کشش تھی۔دونوں کالج اور یونیورسٹی کے طلباء میں مقبول تھے۔دونوں بڑے ذہین، حاضر جواب اور حساس طبیعت کے مالک تھے۔دونوں لاابالی مزاج کے تھے۔دونوں مذہبی احکام اور سماجی پابندیوں سے بالا بالا رہے۔دونوں کو شراب کی لت تھی۔دونوں ذہنی عارضہ کے شکار ہوئے اور دونوں جوانی میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

شراب کا سعادت حسین منٹو کی ادبی زندگی پر اثر رہا ہے۔اس کے لئے زود نویسی اور سہل نگاری کے شکار ہوئے اور گھٹیا کہانیاں لکھیں۔منٹو نے ناول جیسی مقبول صنف پر سنجیدگی سے کام نہیں کیا۔منٹو سے جب پوچھا گیا کہ وہ ناول کیوں نہیں لکھتے تو

آگے وہ لکھتے ہیں:

''میں ویسے ہی افسانہ لکھتا ہوں۔ جس طرح کھانا کھاتا ہوں، غسل کرتا ہوں ،سگریٹ پیتا ہوں اور جھک مارتا ہوں۔''

کبھی افسانہ نہیں بنتا۔ پیشگی دام لے چکا ہوتا ہے۔ ایسے میں منٹو لکھتے ہیں:

''سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا ہوں مگر افسانہ دماغ سے باہر نہیں نکلتا۔ آخر تھک ہار کر بانجھ عورت کی طرح لیٹ جاتا ہوں۔ ان لکھے افسانے کے دام پیشگی وصول کر چکا ہوں، اس لئے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ کروٹیں بدلتا ہوں۔ اٹھ کر اپنی چڑیوں کو دانے ڈالتا ہوں۔ بچیوں کا جھولا جھلاتا ہوں۔ گھر کا کوڑا کرکٹ صاف کرتا ہوں۔ ننھے منے جوتے جو گھر میں جا بجا بکھرے ہوتے ہیں، اٹھا کر ایک جگہ رکھتا ہوں۔ مگر کم بخت افسانہ جو میری جیب میں پڑا ہوتا ہے میرے ذہن میں نہیں اترتا اور میں تلملاتا رہتا ہوں۔ جب بہت زیادہ کوفت ہوتی ہے تو باتھ روم میں چلا جاتا ہوں مگر وہاں بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

سعادت حسین منٹو حد سے زیادہ صاف گو تھے۔ اپنی تحریروں میں وہ کمزوریوں کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے عیوب گنتے ہیں۔ لیکن وہ دوسروں کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ ایسے میں وہ مجھے فرانس کے مفکر اور ادیب رُوسو کی طرح لگتے ہیں۔ خودنوشت سوانح حیات کے حوالے سے جارج برنارڈ شا رقم طراز ہیں:۔

''کوئی اپنے بارے میں سچی بات نہیں لکھتا۔''

لیکن منٹو منفرد تھے۔ صفیہ سے شادی کے ضمن وہ لکھتے ہیں:

''کوئی شریف آدمی مجھ جیسے قلاش اور مفلس کے ساتھ اپنی بیٹی کی زندگی وابستہ کرنے کے لئے کیسے تیار ہو سکتا ہے؟ میرے پاس تھا ہی کیا۔ انٹرنس پاس، وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں۔''

ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

''مجھ میں بحیثیت ایک انسان کے بے حد کمزوریاں ہیں۔اس لئے مجھے ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ یہ کمزوریاں دوسروں کے دل میں میرے متعلق نفرت پیدا کرنے کا موجب نہ ہوں۔''

دوسرے خط میں لکھا ہے:

''میں اپنی زندگی کا تین چوتھائی حصہ بد پرہیزیوں کی نذر کر چکا ہوں۔جب سے ہوش سنبھالا ہے پرہیز نہیں کیا۔اب تو یہ وقت آ گیا ہے کہ لفظ پرہیزی ہی میری ڈکشنری سے غائب ہو گیا ہے۔''

اس کا جواز اپنی منفرد افتادِ طبع کے مطابق یوں دیتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ زندگی اگر پرہیز سے گزاری جائے تو قید ہے۔اگر بد پرہیزی میں گزاری جائے تو بھی قید۔کسی نہ کسی طرح ہمیں اس ادنی جراب کے دھاگے کا ایک سرا پکڑ کر اسے ادھیڑتے جانا ہے اور بس!۔''

سعادت حسین منٹو اور اردو کے معروف خوش گو شاعر اسرار الحق مجازؔ میں گہری یکسانیت ہے۔دونوں اپنے اپنے میدانوں میں شاہسوار تھے۔دونوں کی شخصیت پُر کشش تھی۔دونوں کالج اور یونیورسٹی کے طلباء میں مقبول تھے۔دونوں بڑے ذہین، حاضر جواب اور حساس طبیعت کے مالک تھے۔دونوں لا ابالی مزاج کے تھے۔دونوں مذہبی احکام اور سماجی پابندیوں سے بالا بالا رہے۔دونوں کو شراب کی لت تھی۔دونوں ذہنی عارضہ کے شکار ہوئے اور دونوں جوانی میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

شراب کا سعادت حسین منٹو کی ادبی زندگی پر اثر رہا ہے۔اس کے لئے زود نویسی اور سہل نگاری کے شکار ہوئے اور گھٹیا کہانیاں لکھیں ۔منٹو نے ناول جیسی مقبول صنف پر سنجیدگی سے کام نہیں کیا۔منٹو سے جب پوچھا گیا کہ وہ ناول کیوں نہیں لکھتے تو

ان کا جواب یہ تھا۔

''یہاں روز پینے کے لئے پیسہ چاہیے۔روز افسانہ لکھتا ہوں۔روز کا روز معاوضہ مل جاتا ہے۔اب ناول کون لکھے؟''

اردو نے سعادت حسین منٹو کے بعد دوسرا منٹو پیدا نہیں کیا ہے۔اگرچہ آج منٹو کی صدسالہ سالگرہ پر برصغیر ہند میں تقریبات منائی جارہی ہیں اور منٹو کو خراج تحسین پیش کیا جارہا ہے لیکن اردو کے کسی افسانہ نگار نے ان کے انتقال کے بعد بو، کھول دو، کالی شلوار، ٹھنڈا گوشتاور، وزیل جیسے فحش افسانے لکھنے کی جرأت نہیں کی ہے۔

سعادت حسین منٹو نہ صرف ٹوبہ ٹیک سنگھ جیسے اپنے شاہکار افسانوں کے لئے زندہ جاوید ہیں بلکہ اپنی صاف گوئی، خلوص اور جرأت رندانہ کے لئے بھی یاد رکھا جائے گا۔

☆☆☆

کرشن چندر۔ایک مطالعہ

عبدالغنی شیخ

میں اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں ہی کرشن چندر سے متاثر تھا اور ان کے فن کا مداح بھی۔ کرشن چندر کا زورِ قلم، رومانیت اور زبان کی حلاوت کا سحر تھا کہ میرے دل و دماغ پر ایک خمار آگئیں کیفیت طاری ہوتی تھی۔ میں کچھ لکھنے اور چھاپنے کے لئے کوشاں تھا تب بہت سارے کہانی کار کرشن چندر کے چراغ سے اپنے چراغ جلا رہے تھے۔ میں نے بھی کرشن چندر کے چراغ سے اپنا دیا جلایا۔

کرشن چندر نے نوے کتابیں لکھی ہیں۔ ماسوائے چند میں نے ساری کتابیں پڑھ لیں۔ لیہہ میں شمع، بیسویں صدی اور بانو آتے تھے۔ ان میں گاہے گاہے کرشن چندر کی کہانیاں چھپتیں تھیں۔ رسالہ خریدنے کے لئے کرشن چندر کا نام کافی تھا۔ ہندو پاک کے تمام معیاری جریدوں میں کرشن چندر کی تخلیقات چھپتی تھیں۔ سالنامہ کرشن چندر کی کہانی کے بغیر ادھورا تھا۔ جو سرِ فہرست چھپتی تھی۔ اس کے بعد بالترتیب خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم وغیرہ کی کہانیاں چھپتی تھیں۔ 'شمع' کی بڑی دھوم تھی۔ ایک لاکھ سے زیادہ اس کی اشاعت تھی۔ جب شمع میں کرشن چندر کا مزاحیہ ناول 'ایک گدھے کی سرگزشت'، قسط وار چھپا تو ہر ماہ بے تابی سے اس کا انتظار رہتا تھا۔ شمع گھر گھر پہنچتا تھا اور کرشن چندر جانا پہچانا نام تھا۔

'ایک گدھے کی سرگزشت'، کے بعد مصنف کا دوسرا ناول 'گدھے کی واپسی' قسط وار چھپا تھا۔ اس دوران 'شاعر' میں کرشن چندر کے بارے میں ایک خصوصی شمارہ جرا کرنے کے بارے میں ایک اشتہار نکلا۔ میں نے ایک مضمون بھیجا جو کرشن

چندر کے فن پر نقد و نظر ہی نہیں تھا بلکہ کرشن چندر کے تئیں میری عقیدت بھی تھی۔ 'شاعر' کے مدیر اعجاز صدیقی نے ایک خط میں مجھے لکھا تھا کہ مضمون میں ابھارے گئے ایک نکتے کے بارے میں وہ کرشن چندر سے تصدیق کرائیں گے۔ میں نے لکھا تھا کہ کرشن چندر کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی نگارشات میں اُردو کو نئے نئے خوبصورت الفاظ دیئے۔ یہ الفاظ لغت میں تو ہونے چاہئیں، لیکن صفحہ قرطاس پر نہیں آتے۔ نگینہ انگوٹھی اور زیور میں خوبصورت نظر آتا ہے، الگ نہیں۔ کرشن چندر نے محاوروں، تلمیحوں اور الفاظ کو اپنے جملوں میں یوں سمویا ہے کہ بڑے خوش آئند اور نظر نواز لگتے ہیں۔ میں نے چند الفاظ کا حوالہ بھی دیا ہے۔ بہر حال مضمون شائع ہوا۔ یہاں اس سے دھرانے سے میری مراد یہ ہے کہ کرشن چندر نے شیریں اور خوبصورت الفاظ کے برمحل استعمال سے اردو کو خوب تر بنایا۔

گزشتہ صدی کی ساٹھ کی دھائی میں کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی سرینگر آئے۔ لالہ رخ یا بڈشاہ ہوٹل میں استقبالیہ دیا گیا۔ کرشن چندر نے مختصر تقریر کی۔ کسی نے کرشن چندر کے حوالے سے لکھا ہے کہ اردو ادب پر بونے سوار ہیں۔ کرشن چندر ٹھگنے قد اور گھٹے گھٹے بدن کے تھے۔ تاہم چشمے کے پیچھے ان کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ ان عقابی آنکھوں نے دنیا اور زندگی کا عمیق مطالعہ کیا تھا جو دوسرے دیکھ نہیں پاتے ،ان کو دیکھا تھا، یہی مشاہدے کرشن چندر کی کتابوں کے ہزاروں صفحات میں جلوہ گر ہیں۔ محمد حسن عسکری نے لکھا ہے۔

"کرشن چندر کی آنکھوں میں شعریت ہے تفکر ہے۔ یہ آنکھیں آپ کی روح میں اتر جانا چاہتی ہیں۔ آپ کی زندگی کی ٹریجڈی ڈھونڈنے کے لئے بے قرار ہے۔" میں نے دیکھا کہ کرشن چندر کے ہونٹوں پر ایک سدا بہار طنزیہ مسکان ہے۔ اس طنزیہ مسکان نے کرشن چندر کی کتابوں میں الفاظ میں ڈھل کر ہزاروں لاکھوں لوگوں کو

مسکرایا اور ہنسایا ہے۔

کرشن چندر کے طنز و مزاح سے متعلق یہاں پہ محمد حسن عسکری کا حوالہ دوں گا جو انہوں نے اپنے مضمون ''اُردو ادب میں ایک نئی آواز'' میں لکھا ہے۔

''کرشن چندر کی طبیعت میں کافی طنز ہے۔ آپ اس سے گفتگو کرتے کرتے یکا یک چونک پڑیں گے اور ڈریں گے کہ شاید وہ آپ کو اپنے طنز کا تختہ مشق بنا رہے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ آپ پر واضح ہوگا کہ وہ آپ پر نہیں بلکہ اس ماحول پر جس نے آپ کو پیدا کیا ہے، طنز کر رہا ہے۔''

اس خوبصورت شہر میں میں نے کرشن چندر سمیت بہت ساری ہستیوں کو گلفشانی کرتے دیکھا ہے، جن کو اردو سے براہ راست یا بالواسط وابستگی رہی ہے۔ خواتین افسانہ نگار عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کو اپنی زندگی اور فن پر اظہار خیال کرتے دیکھا ہے۔ فراق گورکھپوری، سردار جعفری اور جوش ملیح آبادی کے کلام کو ان کی زبانی سنا۔ یہاں مولانا ابو کلام آزاد اور خان عبد الغفار خان کے اجتماعات میں شرکت کا موقع ملا، جہاں انہوں نے خطاب کیا۔ آل احمد سرور، محمد حسن اور شکیل الرحمٰن جیسے بلند پایہ ناقدوں کو بولتے دیکھا اور اسلامیات کے بارے میں مولانا وحید الدین خان اور مولانا حفظ الرحمٰن کے خیالات سے فیض یاب ہوا۔ بات کرشن چندر کی ہو رہی تھی۔ اپنے محبوب ادیب کو بالمشافہ گفتگو کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ استقبالیہ کے بعد ان کو اندرون شہر اسلامیہ کالج جانا تھا۔ میں نے پیچھا کیا۔ ان دنوں شہر میں ٹانگہ چلتا تھا۔ ٹرانسپورٹ کا مسئلہ تھا۔ بہر حال میں اسلامیہ کالج پہنچا۔ کرشن چندر اپنی تقریر کر چکے تھے۔ طلباء نے سلمیٰ صدیقی سے تقریر کرنے کے لئے اصرار کیا۔

انہوں نے فصیح اردو میں مختصر تقریر کی۔

میں نے کرشن چندر کے اکثر ناول پڑھے ہیں۔ انہوں نے غالباً ڈیڑھ درجن ناول لکھے ہیں۔ 'شکست' اور 'جب کھیت جاگے' ان کے ابتدائی ناول تھے۔ تب ان کے فن میں پختگی نہیں آئی تھی۔ پھر بھی یہ ناول اس زمانے میں بڑے پسند کیے گئے۔ ان کے بعد سدا رواں دواں ایک چشمہ کی طرح ان کے قلم سے کہانیوں کے ساتھ ساتھ ناولوں اور ناولٹوں کا سوتا پھوٹنے لگا۔ جیسے دل کی وادیاں سو گئیں، آسمان روشن ہے۔ چاندی کا گھاؤ، مٹی کے صنم، میری یادوں کے چنار، باون پتے، زرگاؤں کی رانی، ایک واٹلن سمندر کے کنارے، سڑک واپس جاتی ہے، غدار، ایک عورت ہزار دیوانے، گدھے کی واپسی، بچوں کے ناول چڑیوں کی الف لیلیٰ، الٹا درخت وغیرہ۔ میں نے سارے ناول پڑھے۔ آدھی صدی گزرنے کے باوجود چند ناول میرے ذہن پر آج بھی منقش ہیں۔

پھر ایک دور آیا، میں نے اپنی بساط کے مطابق فکشن کی کائنات کی پنہائیوں میں ازان بھری۔ موپاساں، او ہنری، چیخوف، میکسم گورکی، سومرسٹ مام، ایلیا اہرن برگ، ورجینا وولف، بالزاک، سٹین بیگ، ہمینگوے کن کن کے نام لوں، سینکڑوں کہانی کاروں کے ناول اور کہانیاں پڑھیں۔ انگریزی میں ہمیشہ کی طرح یہ کتابیں دستیاب تھیں، تب اردو میں بھی کہانیوں اور ناولوں کا ترجمہ ملتا تھا۔ اردو رسائل میں غیر ملکی کہانیاں چھپتی تھیں۔ اکثر پاکستانی رسائل سے Reproduce نقل کی جاتی تھی۔ آج اردو سائل میں شاذ و نادر ہی غیر ملکی زبانوں کی کہانیوں کا ترجمہ ملتا ہے۔ وادی کشمیر میں مرحوم ابن اسماعیل (غلام نبی) اپنے جریدہ 'بزم ادب' میں عالمی کہانیوں کا اردو ترجمہ دیتے تھے۔ ان کی ناگہانی وفات ایک بڑا نقصان ہے۔ عالمی فکشن کے مطالعہ کے بعد میں نے اپنے پسندیدہ ادیب کرشن چندر کی کہانیاں

پڑھیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کے فن کے حُسن کے ساتھ اس کا قبح بھی محسوس کیا۔ پہلے کی طرح کرشن چندر کی ہر تخلیق پڑھ کر خمار آگیں کیفیت طاری نہیں ہوئی۔ ایسے میں احتشام حسین کا حوالہ دوں گا۔

"تقابل کا عمل ذہن کے اندر جاری رہتا ہے۔
ترجیحات کے زینے اونچے نیچے ہوتے رہتے
ہیں۔ پسندیدگی کے مدارج گھٹتے بڑھتے رہتے
ہیں۔"

تاہم میرے مذکورہ تبصرہ سے کرشن چندر کی عظمت پر آنچ نہیں آتی ہے اور نہ اس سے کرشن چندر کے پرستاروں میں کمی ہوگی۔ کرشن چندر نے اُردو زبان کو شہکار کہانیاں اور ناول دیئے ہیں۔ اردو ایک زندہ جاوید زبان ہے۔ صدیوں بعد جب اردو فکشن پر تبصرہ ہوگا تو پریم چند اور کرشن چندر کے نام سب سے پہلے لئے جائیں گے۔

کتابوں اور رسائل میں کرشن چندر کی بہترین کہانیوں کا حوالہ دیا جاتا ہے ان کہانیوں میں ان داتا، ٹوٹے ہوئے تارے، زندگی کی موڑ پر، بالکونی، مہالکشمی کا پل، دو فرلانگ لمبی سڑک، کالو بھنگی، غالیچہ، تائی ایسری، پورے چاند کی رات، گرجن کی ایک شام، دانی، شہزادہ اور پشاور ایکسپریس شامل ہیں۔ ان ہی کہانیوں کو اکثر دہرایا جاتا ہے۔

میرے ذہن میں ان کے علاوہ بھی متعدد بہترین کہانیاں ہیں۔ کئی دہائیوں پہلے پڑھی ہوئی دو کہانیاں آج بھی مجھے یاد آرہی ہیں۔ ان میں ایک کہانی 'دلیپ کمار کا نائی' ہے۔ جو ماہنامہ 'شمع' میں چھپی تھی۔ ہمارے سماج میں "فلموں"، یعنی "جن کو فلموں

سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے'' کی کمی نہیں ہے جو اپنی پسند کے فلمی اداکاروں سے جنون کی حد تک لگاؤ رکھتے ہیں۔ ایک اناڑی لیکن شاطر اس کا فائدہ اٹھاتا ہوا ایک دوکان پر 'دلیپ کمار کا نائی' کا سائن بورڈ لگاتا ہے۔ اس کی دکان کے سامنے دلیپ کمار کے سٹائل پر بال کٹوانے کے لیے لمبی قطار لگتی ہے اور وہ اپنی حجامت سے گاہکوں کے بالوں کوستیاناس کرتا ہے۔ آخر کار پولیس اس کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ جب جیل کی ہوا کھا کر باہر نکلتا ہے تو کہتا ہے۔

''دلیپ کمار کا نائی نہ رہا تو کیا ہوا۔ راج کپور کا درزی بنوں گا''

دوسری کہانی 'ہائیڈروجن بم کے بعد' ہے۔ جو 'بیسویں صدی' کے ایک سالنامہ میں چھپی تھی اور کرشن چندر کے افسانوں کے مجموعے کا نام بھی ''ہائیڈروجن بم کے بعد'' ہے۔ اس کہانی کی تھیم یہ ہے کہ تیسری جنگِ عظیم کے بعد ہماری یہ دنیا خاکستر ہو جاتی ہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں قدرے درندے اور جانور بچے ہیں۔ انہوں نے جانوروں کی تفریح کے لیے انسانوں کا چڑیا گھر کھولا ہے۔ جس میں جنگ میں بچے چند انسانوں کو لوہے کے پنجروں میں نمائش کے لئے رکھا ہے۔ باہر کاؤنٹر پر ایک بندر ٹکٹیں فروخت کر رہا ہے۔

کرشن چندر قارئین میں یہ تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہوا ہے کہ محض اپنے لالچ، جنگجویانہ ذہنیت اور حماقتوں کی وجہ سے انسان نے اپنے ہاتھوں سے اپنے اس خوبصورت سیارے کو تباہ کیا ہے۔

میں نے ایک دفعہ 'آج کل' کے مدیر نند کشور وکرم سے گلا کیا کہ کچھ مدت سے 'آج کل' میں کرشن چندر کی کوئی کہانی نظر نہیں آ رہی ہے۔ وہ بولے حکومت نے ایک کہانی کے لئے جو معاوضہ رکھا ہے کرشن چندر نے اپنی کہانی کے لئے اس سے زیادہ فیس رکھی ہے۔ انہوں نے ایک انوکھی بات بتائی کہ ڈاک خانے سے ان کی کہانیاں باخذ

قیمت حاصل کی جاسکتی ہیں۔ سلمیٰ صدیقی نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ ہندی جریدے کرشن چندر کو ان کی کہانیوں کے لئے اچھا معاوضہ دیتے ہیں۔

کرشن چندر نے افسانے، ناول، انشائیے، خاکے، رپورتاژ، مضامین اور ڈرامے اور درجنوں فلمی کہانیاں لکھی ہیں۔ظ۔انصاری رقم طراز ہیں:

''کرشن چندر کے اسٹور میں ہر طرح کا مال بھرا ہے۔''

گوپی چند نارنگ نے کرشن چندر کو ''سمندر'' کہا ہے۔احتشام حسین نے لکھا ہے:

''کرشن چندر کے اکثر افسانوں میں مجھے وہ سب کچھ ملتا ہے، جس کے لیے میں افسانے پڑھتا ہوں۔''

کرشن چندر زودنویس تھے۔زودنویسی اچھے ادب کی تخلیق کی راہ میں ایک سنگ گراں ہے۔کئی دفعہ کرشن چندر کے فن کے معائب اس کی خوبصورت زبان، جذبات نگاری اور رومانیت کے لبادے میں چھپ جاتے ہیں۔تاہم عمومی طور وہ زودنویسی کے ساتھ خوب نویس بھی تھے۔ان کا دماغ بڑا ذرخیز تھا۔وہ ایک انگریزی جریدہ بھی نکالنا چاہتے تھےلیکن مصروفیات نے اجازت نہیں دی۔

کرشن چندر کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔میرا خیال ہے ایک افسانہ نگار کے ذہن میں شعوری یا غیر شعوری طور ایک تھیم آتی ہے۔کرشن چندر پہلے ہی اس تھیم پر لکھ چکے ہوتے ہیں۔مجموعی طور پر وہ پیدائشی ادیب تھے۔

اردو کے سرکردہ نقاد اس امر پر متفق ہیں کہ کرشن چندر نے زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔اس لحاظ سے وہ اردو کے دوسرے کہانی کاروں سے منفرد اور یکتا ہیں۔وزیر آغا رقم طراز ہیں:

''افسانہ نگار (کرشن چندر) کے سامنے زندگی اپنی تمام وسعتوں اور بوالعجبیوں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے اور وہ ناظر

کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے بازاروں، میدانوں، پہاڑوں اور
مرغزاروں میں سے گزرتا چلا گیا ہے۔ایک بلند ٹیلے پر کھڑے
ہو کر ان تمام ناہمواریوں پر ہنستا چلا گیا ہے۔ جو عام لوگوں کی
نگاہوں سے سدا اوجھل رہتی ہیں۔"

کرشن چندر کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

"کرشن چندر کے فن میں چوٹیاں بھی ہیں اور وادیاں
بھی۔ ان میں جھیلیں اور جھرنے بھی ہیں اور بل کھاتی ہوئی
ندیاں چاندنی کی طرح چمکتی ہیں۔"

بقول محمد حسن عسکری

"اگر کوئی زندگی کو پی سکتا ہے تو وہ کرشن چندر ہے"

کرشن چندر کو برگد کے ایک بڑے پیڑ سے تشبیہ دیتے ہوئے محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

"کرشن چندر نے فن کی بلندیوں کو چھو لیا تھا بلکہ وہ فن کی
بلند چوٹیوں پر دھونی رمائے ہوئے ایک ایسا بیراگی تھا جس نے
پستیوں کے عمیق مطالعہ میں اپنی عمر کے چار عشرے صرف کر
دئے۔"

مقصدیت ایک ادیب کیلئے مقدّم ہوتی ہے۔کرشن چندر اس ضمن میں لکھتے ہیں

"میں زاویۂ نگاہ کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ آخر ہم لکھتے ہیں
تو کیوں لکھتے ہیں؟"

کرشن چندر کو نہ ستائش کی تمنا رہی ہے اور نہ صلہ کی
خواہش۔ ان کو صرف لکھنے کی غرض تھی میری دانست میں ان
کو اپنے وطن ہندوستان میں کوئی ادبی ایوارڈ نہیں ملا۔ میں نے

کہیں پڑھا کہ ساہتہ اکادمی نے ایوارڈ کی پیشکش کرتے ہوئے انہیں اپنی بہترین کہانیوں پر مبنی ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی ۔کرشن چندر نے اس پر عمل نہیں کیا۔کل بھی اور آج بھی متعدد ایوارڈ پانے والے اکثر ادیبوں کو کرشن چندر کی جیسی نہ شہرت ملی ہے اور نہ کرشن چندر کی سی ان کی کتابیں پڑھنے والے قارئین ملے ہیں

☆☆☆

یادوں کے لمس: برج پریمی

-عبدالغنی شیخ

۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ میں سرینگر میں وٹرنری سٹاک اسسٹنٹ کی ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ میٹرک پاس کیا تھا۔ آگے پڑھنے کا شوق تھا لیکن غربت کی وجہ سے کالج میں داخلہ نہیں لے سکا تھا۔ سرینگر میں اُن دنوں گاہے گاہے کسی ہوٹل یا کسی ادیب کے گھر ادبی مجلسیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جلد ہی مجھے اُن کی بُو باس مل گئی اور میرا ادبی ذوق مجھے ان مجلسوں میں کھینچ لے گیا۔ ادب کا چسکا میں لیہ سے اپنے ساتھ لایا تھا اور لکھنے کی چھوت بھی لگی تھی لیکن یہ چھوت بڑی خوبصورت اور نفع بخش تھی۔ اس نے مجھے حوادثِ زمانے کا مقابلہ کرنے، جینے اور زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ ایک ادبی مجلس میں، میں نے اپنی ایک کہانی 'آرزوئیں' پڑھی۔ یہ مجلس رحمٰن راہی کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کہانی پر ویدراہی ایک منی فلم بنا رہا ہے۔ مجلس میں کہانی یا نظم سنانے کے بعد اس پر سیر حاصل تبصرہ اور مباحثہ ہوتا تھا۔ ان مجلسوں میں نوجوان، ادھیڑ اور عمر رسیدہ ادیب، ادب نواز اور شاعر شرکت کرتے تھے۔ میرے ذہن کی تختی پر دھندلی سی یہ یاد محفوظ ہے کہ نوجوان ادیبوں میں ایک برج پریمی بھی تھا۔

اُن دنوں ترقی پسند ادب کا بڑا چرچا تھا۔ چھوٹے بڑے ادیب اس تحریک سے متاثر تھے۔ پرولتاری، بوژوا اور رجعت پسند جیسے الفاظ انہی دنوں میں نے سُنے۔ میرے ساتھ بہت سے ہمعصر نوجوانوں کو ادب سے گہرا شغف تھا اور ہر ایک کو اپنا نام

چھپانے کی بڑی اُمنگ تھی۔اُن کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا

کہ تخلیق کے لئے میرے دماغ میں جو جوار بھاٹا سا اُٹھتا ہے۔ویسا ہی جوار بھاٹا ہر ایک کے دماغ میں موجزن ہے۔شاید ہر ایک کا کوئی اپنا ادبی ہیرو تھا۔میں کرشن چندر کا پرستار تھا اور ان کی بیسوں کتابیں پڑھ چکا تھا۔ برج پریمی کا چہیتا ادیب سعادت حسن منٹو تھا۔جیسا کہ برج پریمی پر پشکر ناتھ کی سرگذشت سے معلوم ہوا کہ پریمی اور وہ عالی کدل کے پریمی کے آبائی مکان میں منٹو کے افسانوں پر ہفتوں بحث کرتے۔منٹو کی کہانیوں پر سر دھنتے اور دل کھول کر داد دیتے تھے۔ایک مرتبہ میں نے کرشن چندر کو ایک تعریفی خط لکھا۔ہندوستان کے انتہائی شمالی نقطہ پر رہنے والے ایک قاری کی حیثیت سے جواب بھی اخذ کرنے کی کوشش کی لیکن خط کا جواب نہیں آیا۔اس سے پہلے کہ میں دوسرا خط لکھتا میں نے کرشن چندر کی کہانی کبوتر کا خط پڑھی۔جس میں اس قسم کے خط لکھنے والوں کا مذاق اُڑایا تھا تب میں نے خط لکھنے کا ارادہ ترک کیا۔میں اپنے محبوب ادیب کرشن چندر پر کرشن چندر نمبر کے لئے پونے تین صفحات کا ایک مختصر مضمون لکھ سکا جبکہ برج پریمی نے منٹو پر ایک معرکتہ الآرا کتاب لکھی۔اس طرح منٹو کے تیئں اپنا حق ادا کیا اور ہم جیسے کئی لکھنے والے ہاتھ ملتے رہ گئے۔اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی اور لکھنے والے اور قاری دونوں نے سراہنا کی ہے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں ادا کئے ہیں۔

"منٹو پر لکھی گئی کتابوں میں کوئی بھی کتاب اتنی مکمل اور ہمہ گیر نہیں، جتنی پریمی کی کتاب ہے"

ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:۔

"منٹو پر ایسی جامع کتاب اب تک اردو میں نہیں لکھی گئی۔منٹو پر آئندہ بھی تحقیقی کام ہوگا۔لیکن آپ کا یہ مقالہ بنیاد کا کام دے گا۔"

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن رقم طراز ہیں:۔

''منٹو پر ان کی تصنیف لا مثال اور منفرد ہے۔ منٹو کے عوامل اور واقعاتِ زندگی کا ایک گرانمایہ خزنیہ ہے''

پروفیسر آل احمد سرور لکھے ہیں؛۔

منٹو پر برج پریمی کی کتاب ایک بڑے فنکار کو سمجھنے اور پرکھنے میں بہت مدد دیتی ہے''

پروفیسر گیان چند جین؛۔

''کتاب ہذا خوب سے خوب تر ہے۔ بہت مفصل، جامع، اور تحقیقی۔ آخری جزد ''سعادت حسن منٹو۔ ایک نظر میں'' بیت الغزل ہے۔ کوزے میں دریا بھرنا اسی کو کہتے ہیں'

پروفیسر گوپی چند نارنگ؛۔

برج پریمی کا کام منٹو پر بنیادی نوعیت کا ہے۔ وہ ہندوستان کے اان معدودے چند لوگوں میں ہیں۔ جنہوں نے سعادت حسن منٹو کا مطالعہ نہایت دلسوزی سے کیا ہے''

کشمیری لال ذاکر؛۔

اتنی خوبصورت کتاب پر اپنے کم سے کم ایک درجن ناول قربان کرسکتا ہوا۔

اوپیندر ناتھ اشک؛۔ منٹو پر تمہارا مقالہ لاجواب ہے۔ تمہاری تحقیق کی داد دیتا ہوں

پروفیسر محمد حسن؛۔ برج پریمی کی ابھی تک منٹو پر یہ کتاب حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے اور اردو کے افسانوی ادب کے ہر طالب علم کے لئے لایق مطالعہ ہے

پروفیسر جگن ناتھ آزاد؛۔آپ نے منٹو مرحوم کے بارے میں ایک انسیکلو پیڈیا تیار کردی ہے

وارث علوی؛۔منٹو کی زندگی اور کارناموں پر پہلی تحقیقی اور جامعہ کتاب ڈاکٹر برج پریمی نے لکھی ہے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی ؛۔ برج پریمی نے اپنے اس مقالے میں موضوع کو احتیاط اور ہنرمندی سے برتا ہے اور منٹو کی کہانیوں اور ڈراموں کا مطالعہ انتہائی لگن، گہری بصیرت اور معروضی انداز نظر سے کیا گیا ہے

ڈاکٹر حامدی کاشمیری؛۔ برج پریمی نے پرانی اور بوسیدہ تصورات ترک کر کے منٹو کی طوفانی زندگی اور ان کے کارناموں کے بارے میں نئے اور اہم حقایق سامنے لائے ہیں

ابو سعید قریشی (لاہور پاکستان)؛۔ آپ کی کتاب مبارکبادی کی مستحق ہے۔اتنی محنت کم لوگ کرتے ہیں.

مانک ٹالہ؛۔آپ نے منٹو کی زندگی اور ادب کا کوئی گوشہ ادھورا نہیں چھوڑا ہے

حمیدہ معین رضوی؛۔ جتنا وسیع اور وقیع کام برج پریمی نے منٹو پر کیا ہے اتنا پاکستان میں بھی کسی نے نہیں کیا ہے

پروفیسر مسعود حسن؛، واقعی آپ نے حالات و واقعات جمع کرنے میں بڑی کدو کاوش سے کام لیا ہے اور منٹو کا جائزہ نہایت ہی شگفتہ اسلوب نگارش میں پیش کیا ہے

اکابرین اردو کی کسی کتاب کے بارے میں اتنی جامع،

وزن دار، اور جاندار تعریفیں شاذ و نادر ہی نظر میں آتی ہیں۔

منٹو کے بارے میں برج پریمی کی دوسری کتاب ''منٹو کتھا'' ایک اور گرانمایہ تصنیف ہے۔ اپنی دور رس تحقیق سے انہوں نے منٹو کے بارے میں نئے انکشافات کئے ہیں۔ جو کل تک پردہ ء راز میں تھے

کشمیر کی تاریخ کے حوالے سے برج پریمی کے لکھے ہوئے مضامین کے تناظر میں انہیں بطور کشمیر شناس اور محبّ کشمیر یاد کیا جاتا ہے

ڈاکٹر پریمی رومانی اپنے مضمون ''برج پریمی بحثیت کشمیر شناس'' اور محبّ کشمیر'' میں لکھتے ہیں'' موجودہ دور میں جن عالموں، فاضلوں، تاریخ دانوں اور کشمیریات سے دلچسپی رکھنے والوں نے اس موضوع کو اپنے قلم کی جولانی سے نئی جہت عطا کی، ان میں ڈاکٹر برج پریمی کا نام سرفہرست ہے''

محمد یوسف ٹینگ اس ضمن میں رقم طراز ہیں''کشمیر کی تاریخ کی بھول بھلیوں میں بڑے بڑوں کے راستے گم ہوئے لیکن پریمی نے بڑی احتیاط سے ان خندقوں کو پار کیا ہے۔ پریمی کا بے تعصب اور وسیع نقطہ نظر اس کتاب کے ہر ورق پر آشکارا ہے''

برج پریمی حقیقی معنوں میں کشمیر کے عاشق تھے۔ اس نسبت سے پروفیسر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں :۔''برج پریمی کی کشمیریات سے وابستگی عشق کا درجہ رکھتی ہے اور وہ اس موضوع

کے بعض مستعور پہلوؤں کو بے نقاب کر رہے ہیں اور ایک سپوت کی طرح مادر وطن کی عظمت دیرینہ سے اردو دنیا کو روشناس کر رہے ہیں۔

''پروفیسر قمر رئیس نے تو یہاں تک لکھا ہے'' میرا خیال ہے کہ عبدالاحد آزاد مرحوم کے بعد کشمیری زبان و ادبیات پر سب سے وقیع کام برج پریمی کا ہی ہے'' اسی طرح کشمیر اور اس کی تاریخ کے حوالے سے جگن ناتھ آزاد، نشاط انصاری، موتی لال ساقی، پروفیسر ظہور الدین، پروفیسر منظر اعظمی، اور پروفیسر اسد اللہ وانی نے کشمیر کے تیئں ان کے تحقیقی کام کی سراہنا کی ہے اور ان کے کشمیر سے بے پناہ لگاو کا تذکرہ کیا ہے۔

بلاشبہ برج پریمی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک معروف محقق، نقاد، اور افسانہ نگار بھی تھے۔

پروفیسر محمد اسد اللہ وانی، برج پریمی کی افسانہ نگاری پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے'' برج پریمی نے کشمیر کے پسماندہ عوام کے ساتھ برتے جا رہے رویے، ناانصافی، ظلم و ستم، طبقاتی کشمکش اور سماجی نابرابری کو موضوع بنا کر فنکارانہ چابکدستی سے افسانوں کی لڑی میں پرویا ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان میں پختگی، بیان میں حلاوت اور اسلوب میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔

دیپک بدکی رقمطراز ہیں'' برج پریمی اشتراکیت سے بہت متاثر ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں کشمیر کے غریب کسانوں

اورمزدوروں کی خستہ حالی اور بے کسی کو موضوع بناتے تھے۔

ڈاکٹر چمن لال بھگت کا تاثر ہے کہ برج پریمی نے جہاں کشمیر میں ہورہے ناانصافیوں اور سماجی وطبقاتی بحران کو موضوع بنایا ہے۔ وہاں ان کے افسانوں میں شہری اور دیہاتی زندگی کا امتزاج بھی ملتا ہےاور حسن وعشق کا معرکہ بھی''

برج پریمی ان ادیبوں میں تھے جو ریاضت کرتے ہیں جو خونِ جگر دے کر ادب کے شاہ پارے تخلیق کرتے ہیں۔ جنہیں نہ ستائش کی تمنا ہے اور نہ صلے کی خواہش۔ پریمی غریب تھا۔ ان کے والد ایک اسکول ٹیچر تھے۔ ان کے پاس وسائل اور سفارش نہیں تھی۔ ایسے لوگ صرف اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرتے ہیں اور اپنی محنت کے بل بوتے پر کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

پشکر ناتھ، برج پریمی سے متعلق لکھتا ہے:۔

''پریمی کو زندگی میں آگے بڑھنے کی کتنی تمنا تھی۔ آگے بڑھنے کے لئے اُس کے پاس ایک ہی راستہ تھا۔ تعلیم اور مزید تعلیم کیونکہ سفارش اور رشوت اور سیاسی، سماجی یا اقتصادی پشت پناہی نہ اُس کے پاس تھی اور نہ میرے پاس۔ چنانچہ سنگل ٹیچر اسکول کی ماسٹری سے برج پریمی ترقی کرتے کرتے کشمیر یونیورسٹی کے اُردو کے پروفیسر ہو گئے۔''

برج پریمی نے متنوع موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ اس کی تحریروں میں صمد میر اور کشمیری لوک گیتوں کا پس منظر سے لے کر سعادت حسن منٹو اور پریم ناتھ پردیسی تک کے موضوعات شامل ہیں۔

برج پریمی کے طرزِ تحریر اور اسلوب پر کرشن چندر اور منٹو کا اثر ہے۔ نشستِ الفاظ کی خوبی ترکیب کی دلِ آویزی اور سلاست اس کے خاص جوہر ہیں۔ زبان میں

دلکشی، پرکاری، سادگی اور رنگینی ہے۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما پر تحقیقی کام کر رہے تھے اور اس موضوع پر ایک جامع کتاب لکھنا چاہتے تھے جو برج پریمی جیسے محنتی اور ذہین قلم کار سے امید کی جاسکتی تھی۔ اپنی کتاب کی تخلیق کے سلسلے میں برج پریمی نے ریاست کے تمام اُردو ادیبوں اور شاعروں سے رابطہ قائم کیا تھا۔ اسی اثنا میں یونیورسٹی میں پریمی سے میری ملاقات ہوئی، روبرو ملے تیس سال سے زیادہ کی طویل مدت بیت چکی تھی۔ جہلم اور سندھ میں تب سے بہت پانی بہہ چکا تھا۔ اس دوران میں گاہے گاہے پریمی کی تخلیقات مختلف رسائل میں دیکھتا اور پڑھتا رہا اور پریمی سے غائبانہ ملاقات جاری رہی۔ ادیب پریمی کو ان کی تخلیقات کے آئینے میں دیکھا تھا۔ ہر ایک انسان کو برج پریمی سے مِل کر خوشی ہوتی تھی۔

برج پریمی نے کئی دفعہ مجھ سے میری مطبوعہ کتابیں مانگیں۔ میرے پاس اپنی کتابوں کے دو تین سے زیادہ فاضل کاپیاں نہیں تھیں۔ کاپیاں ڈھونڈنے میں کوتاہی ہوئی۔ جب کتابوں کا انتظام ہوا تو میں نے پریمی کے رفیق کار پروفیسر رشید نازکی سے استدعا کی کہ وہ میری کتابیں برج پریمی تک پہنچائیں "آج کل پریمی علیل ہیں بعد میں لے لیں گے"، رشید نازکی بولے۔ اس کے بعد میں نے برج پریمی سے متعلق کچھ نہیں سنا اور تبھی سنا جب وہ اس دنیا سے چلے گئے تھے۔

برج پریمی کی زندگی کا چراغ وقت سے پہلے بجھ گیا۔ ابھی ان کے پڑھنے لکھنے کے دن تھے۔ ابھی انہیں بہت کام کرنا تھا۔ ان کے سامنے لکھنے اور چھپانے کے لئے لمبے چوڑے منصوبے تھے۔ پریمی کی غیر مطبوعہ تصانیف میں سپنوں کی شام، (افسانوں کا مجموعہ) مشاہیر ادب کے خطوط، پریم ناتھ پردیسی۔ شخص اور فنکار، اور منٹو کتھا شامل ہیں جن کو ان کے ہونہار بیٹے ڈاکٹر پریمی رومانی نے منظر عام پر لایا۔ وہ اپنے والد کی شخصیت اور فن پر درج ذیل کتابیں شایع کر چکے ہیں، برج پریمی۔ ایک

اور مزدوروں کی خستہ حالی اور بے کسی کو موضوع بناتے تھے۔

ڈاکٹر چمن لال بھگت کا تاثر ہے کہ برج پریمی
نے جہاں کشمیر میں ہو رہے ناانصافیوں اور سماجی وطبقاتی بحران
کو موضوع بنایا ہے۔ وہاں ان کے افسانوں میں شہری اور
دیہاتی زندگی کا امتزاج بھی ملتا ہے اور حسن وعشق کا معرکہ بھی''

برج پریمی ان ادیبوں میں تھے جو ریاضت کرتے ہیں جو خونِ جگر دے کر ادب کے شاہ پارے تخلیق کرتے ہیں۔ جنہیں نہ ستائش کی تمنا ہے اور نہ صلے کی خواہش۔ پریمی غریب تھا۔ ان کے والد ایک اسکول ٹیچر تھے۔ ان کے پاس وسائل اور سفارش نہیں تھی۔ ایسے لوگ صرف اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرتے ہیں اور اپنی محنت کے بل بوتے پر کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

پشکر ناتھ، برج پریمی سے متعلق لکھتا ہے:۔

''پریمی کو زندگی میں آگے بڑھنے کی کتنی تمنا تھی۔ آگے بڑھنے کے لئے اُس کے پاس ایک ہی راستہ تھا۔ تعلیم اور مزید تعلیم کیونکہ سفارش اور رشوت اور سیاسی، سماجی یا اقتصادی پشت پناہی نہ اُس کے پاس تھی اور نہ میرے پاس۔ چنانچہ سنگل ٹیچر اسکول کی ماسٹری سے برج پریمی ترقی کرتے کرتے کشمیر یونیورسٹی کے اُردو کے پروفیسر ہو گئے۔''

برج پریمی نے متنوع موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ اس کی تحریروں میں صمد میر اور کشمیری لوک گیتوں کا پس منظر سے لے کر سعادت حسن منٹو اور پریم ناتھ پردیسی تک کے موضوعات شامل ہیں۔

برج پریمی کے طرزِ تحریر اور اسلوب پر کرشن چندر اور منٹو کا اثر ہے۔ نشستِ الفاظ کی خوبی ترکیب کی دلِ آویزی اور سلاست اس کے خاص جوہر ہیں۔ زبان میں

دلکشی، پرکاری، سادگی اور رنگینی ہے۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما پر تحقیقی کام کر رہے تھے اور اس موضوع پر ایک جامع کتاب لکھنا چاہتے تھے جو برج پریمی جیسے محنتی اور ذہین قلم کار سے امید کی جاسکتی تھی۔ اپنی کتاب کی تخلیق کے سلسلے میں برج پریمی نے ریاست کے تمام اُردو ادیبوں اور شاعروں سے رابطہ قائم کیا تھا۔ اسی اثنا میں یونیورسٹی میں پریمی سے میری ملاقات ہوئی، روبرو ملے تیس سال سے زیادہ کی طویل مدت بیت چکی تھی۔ جہلم اور سندھ میں تب سے بہت پانی بہہ چکا تھا۔ اس دوران میں گاہے گاہے پریمی کی تخلیقات مختلف رسائل میں دیکھتا اور پڑھتا رہا اور پریمی سے غائبانہ ملاقات جاری رہی۔ ادیب پریمی کو ان کی تخلیقات کے آئینے میں دیکھا تھا۔ ہر ایک انسان کو برج پریمی سے مل کر خوشی ہوتی تھی۔

برج پریمی نے کئی دفعہ مجھ سے میری مطبوعہ کتابیں مانگیں۔ میرے پاس اپنی کتابوں کے دو تین سے زیادہ فاضل کاپیاں نہیں تھیں۔ کاپیاں ڈھونڈنے میں کوتاہی ہوئی۔ جب کتابوں کا انتظام ہوا تو میں نے پریمی کے رفیق کار پروفیسر رشید نازکی سے استدعا کی کہ وہ میری کتابیں برج پریمی تک پہنچائیں" آج کل پریمی علیل ہیں بعد میں لے لیں گے" رشید نازکی بولے۔ اس کے بعد میں نے برج پریمی سے متعلق کچھ نہیں سنا اور تبھی سنا جب وہ اس دنیا سے چلے گئے تھے۔

برج پریمی کی زندگی کا چراغ وقت سے پہلے بجھ گیا۔ ابھی ان کے پڑھنے لکھنے کے دن تھے۔ ابھی انہیں بہت کام کرنا تھا۔ ان کے سامنے لکھنے اور چھپانے کے لئے لمبے چوڑے منصوبے تھے۔ پریمی کی غیر مطبوعہ تصانیف میں سپنوں کی شام، (افسانوں کا مجموعہ) مشاہیر ادب کے خطوط، پریم ناتھ پردیسی۔ شخص اور فنکار، اور منٹو کتھا شامل ہیں جن کو ان کے ہونہار بیٹے ڈاکٹر پریمی رومانی نے منظر عام پر لایا۔ وہ اپنے والد کی شخصیت اور فن پر درج ذیل کتابیں شایع کر چکے ہیں، برج پریمی۔ ایک

مطالعہ، برج پریمی شخصیت اورفن، برج پریمی ۔حیات اورادبی خدمات وغیرہ شامل ہیں

برج پریمی کے بے وقت انتقال کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ مجازؔ، منٹو، چیخوفؔ، شیلےؔ، چکبستؔ، شمیمؔ جیسے نہ جانے کتنے سارے شاعر اور ادیب کو وقت سے پہلے موت نے چھین لیا۔ موت اٹل ہے۔ اسے مفر نہیں لیکن جب ایک فن کار جوانمرگی کا شکار ہوتا ہے یا وقت سے پہلے موت سے ہمکنار ہوتا ہے تب بڑی کوفت ہوتی ہے۔ مرنے والے کی زندہ تخلیقات ہی یاد نہیں آتیں بلکہ اس تصوراتی اور قیاسی تخلیقات کا حسرت ناک خیال بھی آتا ہے جس کا سوتا مصنّف کی موت کے ساتھ سوکھ جاتا ہے۔

ابھی ان ۔کہ ہنسنے کھیلنے کے دن تھے۔ ابھی انہیں بہت کام کرنا تھا۔ ان کے سامنے لکھنے اور چھپانے کے لئے لمبے چوڑے منصوبے تھے۔ برج پریمؔی کی غیر مطبوعہ تصانیف میں سپنوں کی شام، (افسانوں کا مجموعہ) مشاہیر ادب کے خطوط، پریم ناتھ پردیسی ۔ شخص اور فنکار، اور منٹو کتھا شامل ہیں جن کو ان کے ہونہار بیٹے ڈاکٹر پریمی رومانی نے منظر عام پر لایا۔ وہ اپنے والد کی شخصیت اور فن پر بھی کافی کام کر چکے ہیں ۔ انہوں نے اپنے والد کی شخصیت اور فن پر بہت ساری کتابیں شایع کی ہیں جن میں برج پریمی ۔ایک مطالعہ، برج پریمی شخصیت اورفن، برج پریمی ۔حیات اورادبی خدمات وغیرہ شامل ہیں

☆☆☆

ایک سپینسٹر (Spinster) سے انٹرویو

عبدالغنی شیخ

''جی ہاں'' میں ایک سپنیٹر ہوں۔لیکن میں اپنے ماضی کے بارے میں آپ کو کچھ بتانا نہیں چاہتی ہوں۔ اسے میرا زخم ہرا ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے، میں نے چند ہمدرد آدمیوں کو اپنی غم ناک اور درد بھری روئداد سنائی ہے۔اور میرا دل تب عارضی طور ہلکا ہوا تھا۔''

''ہم بھی آپ کے ہمدرد ہیں'' سروے کرنے والی ایک لڑکی بولی۔''ہم ایک تنظیم سے وابستہ ہیں، جو مصیبت زدہ عورتوں کے لئے کام کرتی ہے۔اور ان کی مدد کرتی ہے۔ یہاں ہم شادی نہ کرنے والی بڑی عمر کی عورتوں کے بارے میں معلومات جمع کرر ہے ہیں ۔ تا کہ اس اہم سماجی مسئلے کی تہہ میں جائیں ۔ اور اس کا حل تلاش کریں۔''

''ہم کسی کی نجی زندگی سے متعلق کچھ انکشاف نہیں کرتے ہیں''۔سروے سے وابستہ دوسری لڑکی بولی''ہمیں آپ کا نام بھی نہیں چاہئے ۔ آپ صرف اپنی عمر بتائیے۔''

''میں ستر سال کی ہوں'' عورت نے برف جیسے اپنے سفید بالوں پر اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے Spinster کا لفظ کہاں سنا ہے؟ آپ کی تعلیم کیا ہے؟ لڑکی نے

ایک فارم میں خانہ پوری کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے کالج جوائن کیا تھا لیکن گریجویشن نہیں کرسکی۔ ایک روز میں نے اخبار میں پڑھا کہ اس شہر میں چار ہزار دوسو سپنسٹر ہیں۔ میں نے فوراً لغت میں اس کا معنی دیکھا

An unmarried woman who is past the usual age for marrying and is considered unlikely to marry.

(ایک غیر شادی شدہ عورت، جس کی شادی کی عمومی عمر بیت چکی ہے۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی شادی کا امکان کم ہے۔)

تب میری عمر بتالیس سال سے زیادہ تھی۔ یہ لفظ میرے دماغ پر نقش ہو گیا۔ اور آج تک اس کا معنی نہیں بھولا ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں پہلے ہی اپنے آپ کو سپنسٹر کی صف میں شامل کیا تھا۔'' لڑکی بولی: یہ لفظ چھ سو سال سے زیادہ پرانا ہے اور SPIN سے نکلا ہے۔ تب غیر شادی شدہ عورتیں کتائی کا کام کرتی ہوں گی۔

پہلی لڑکی بولی'' آج اس شہر میں غیر شادی شدہ ایسی عورتوں کی تعداد پینتیس (۳۵) ہزار سے زیادہ ہے۔

آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟

''ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ بڑی بہن اور ایک بھائی چل بسے۔ ابھی ہم تین بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں۔''

''بڑی بہن کب چل بسی؟'' دوسری لڑکی نے پوچھا۔

''ان کو فوت ہوئے بہت سال ہوئے ہیں۔ وہ مجھ سے سات سال بڑی تھی۔''

''کیا ان کی شادی ہوئی تھی؟''

''ان کی شادی نہیں ہوئی۔ ایک لڑکے سے اس کا رشتہ طے ہوا تھا۔ لیکن پر وان

نہیں چڑھا۔ مجھے معلوم نہیں ۔ کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ شاید جہیز مانگا ہو اور وہ نہ دے پایا ہو۔ ہمارے ابو اور امی غریب تھے۔ اَن پڑھ تھے۔ ایک مرحلے پہ میری بہن اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی۔ اس کی وجہ رشتے کا ٹوٹنا اور شادی کا نہ ہونا بتایا جاتا تھا۔ اس کو اس لڑکے سے بڑی محبت ہوگی۔ مجھے پورا معلوم نہیں۔ ایک رات وہ گھر سے نکل گئی تھی۔ ہم سبھی سو رہے تھے۔ باہر بھاری برف پڑ رہی تھی۔ دو روز بعد اس کی لاش ملی۔ بہن کی دردناک موت نے ہم تینوں بہنوں کی زندگی پر المناک اثر ڈالا۔ جو ہمارے دماغ سے کبھی نہیں مٹا۔ ہمیں ہمیشہ یہ اندیشہ ستانے لگا کہ ہماری شادی نہیں ہوگی اور ہمارا بھی یہی حشر ہوگا۔ یہ ایک ایسا گھاؤ تھا جو کبھی نہیں بھرا اور جس نے ہماری زندگی میں زہر گھول دیا۔"

عورت کچھ وقفہ کے لئے رُکی اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔"بہن کی موت سے پہلے میں ایک تلخ تجربے سے دوچار ہو چکی تھی۔ ایک لڑکا ندیم مجھ سے محبت کرتا تھا۔ مجھے بھی ندیم سے بڑی محبت تھی۔ ہم ایک دوسرے کو خط لکھتے تھے۔ تب موبائل فون نہیں تھا۔ ندیم اور میری شادی کی تاریخ دو دفعہ بدلی۔ اسی اثناء میں راشد نے مجھ سے محبت کا اظہار کیا۔ وہ مجھ سے شادی کا خواہش مند تھا۔ ہم کالج میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ راشد اچھا لڑکا تھا۔ میں ندیم کو دل دے چکا تھا اور اس سے جی جان سے محبت کرتی تھی۔ اس لئے میں نے ندیم کا حوالہ دے کر راشد کو معذرت کا اظہار کیا۔ ایسے میں ڈھائی سال گزر گئے۔ راشد نے میری سہیلی نوشابہ سے شادی کی ۔ ایک مرحلے پر ندیم نے مجھے خط لکھنا چھوڑ دیا۔ اور میری چٹھیوں کا جواب نہیں دیا۔

ایک روز مجھ پر بجلی سی گری جب میں نے سنا کہ ندیم نے ایک اور لڑکی سے شادی کی ہے۔ میری آآکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور رنج وملال سے گم سُم کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ حتیٰ کہ ڈیپریشن کی شکار ہوئی۔ میں نے خودکشی کی ہوتی اگر میرا چھوٹا بھائی

اڑے نہ آتا۔ اس نے میرا علاج کرایا۔ حوصلہ دیا۔ اس نے ہم تینوں بہنوں کی خاطر شادی نہیں کی۔ اس کے کریانے کی دکان تھی۔ اس نے ہم تینوں بہنوں کو تعلیم دی اور ہماری تمام ضروریات پوری کیں۔ وہ ہماری شادی کے لئے فکر مند تھے۔ وہ ہمیں اکثر ہدایت دیتے تھے کہ اپنی شخصیت اور اپنے لباس کا خیال رکھیں۔ لباس میں بھی اپنی کشش ہوتی ہے۔ صاف ستھری رہیں۔ وہ ہمیں جیب خرچ کے لئے گاہے گاہے روپیہ پیسہ دیتے تھے۔

اِدھر ابو اور امی کو ہماری شادی کا بڑا غم تھا۔ کمرے کی باتیں آنگن میں سنائی دیتی تھیں۔ ایک روز امی کہہ رہی تھیں۔ اگر ہمارے پاس دھن دولت ہوتی تو ہم جہیز دے کر اپنی بیٹیوں کی شادی کرتے۔ ایک روز ابو کہہ رہے تھے کہ شادی سنت رسول ہے۔ ایک حدیث کا حوالہ دے کر انہوں نے کہا کہ ایک غیر شادی شدہ عورت کی شادی رسمی طور ایک پیڑ سے کرنا سنت رسول ہے۔ خدا جانے یہ ضعیف حدیث انہوں نے کہاں سے سنی تھی۔ امی مصلی پر جا کر نماز کے بعد روتی ہوئی لمبی لمبی دعائیں مانگتی تھیں۔ ہم نے ان کو دعا میں یہ کہتے ہوئے سنا ہے۔ اے اللہ، میری بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرائیں۔ سب کی طرح ان کی شادی خانہ آبادی ہو۔

میری آنکھوں کے سامنے میری سہیلیوں اور ہمسائیوں کی یکے بعد دیگرے شادیاں ہوئیں۔ ان کے بچے ہوئے پھر وہ زمانہ آیا ان کو پوتے پوتیاں ہوئیں۔

جس روز ہمارے محلے میں کسی کی شادی پر شادیانے ہوتے۔ ڈھولک کی آواز سنائی دیتی اور شادی کے گیت گائے جاتے تو ہمارے گھر میں موت کی سی، خاموشی طاری ہوتی۔ ہم اپنے جذبات اور محسوسات کو چھپائے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے۔ کچھ نہیں بولتے لیکن ہر ایک ایک دوسرے کی دلی کیفیت کو سمجھتا تھا خاص طور پر ابّو اور امی کے چہرے پر غم کا سایہ منڈلاتا تھا۔

میری عمر سینتیس سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ میں اپنے سے زیادہ اپنی منجھلی بہن کے لئے پریشان رہنے لگی۔ وہ مجھ سے سات سال چھوٹی تھی۔ ایک لڑکا گلی کے موڑ پر اس سے ملنے آتا تھا۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ میرے پاس پندرہ ہزار روپے کی جمع پونجی تھی۔ میں نے یہ رقم اس کو دیا کہ وہ اپنے لئے نئے کپڑے سلائے۔ یہ رقم میرے چھوٹے بھائی کے دیئے ہوئے روپے پیسے تھے۔ جو میں نے جمع کر کے رکھے تھے۔ پھر لڑکے کا آنا چانک بند ہو گیا اور بہت دن نظر نہیں آیا۔ میری بہن اداس اداس رہنے لگی تھی۔ میں نے پوچھا اور وہ رونے لگی۔ وہ لڑکا شادی سے مکر گیا تھا۔

کچھ مدت بعد ایک اور آدمی نے میری منجھلی بہن سے قربت دکھائی۔ میں خوش ہو گئی۔ لیکن یہ قربت زیادہ دن نہیں چلی۔ ایک روز میری بہن غم و غصے میں تھی۔ میرے کرید نے پر اس نے بتایا کہ وہ آدمی شادی سے پہلے جسمانی قربت کا خواہاں تھا۔ بہن نے کہا اس نے اس آدمی کو دھتکارا اور پھر کبھی اپنا منہ نہیں دکھایا۔ میں ان آزمائشوں سے پہلے گزر چکی تھی۔ شادی کا سبز باغ دکھا کر یا دولت کے بل بوتے ورغلانے کی کوشش کی جاتی اور ڈورے ڈالے جاتے لیکن میں ان کے جال میں نہیں آئی۔ غریب اور بے سہارا لڑکیوں کے ساتھ ایسی زیادتیاں ہوتی رہتی ہیں۔

ابو اور امی کی پریشانیوں کو دیکھ کر ایک روز میری منجھلی بہن اور میں نے فیصلہ کیا ہم کبھی ان کے سامنے اپنی محرومی کو ظاہر نہیں ہونے دیں گے اور ان کو تشفی دیں گے۔ چنانچہ ایک روز ہم نے دونوں سے کہا۔ ہمیں شادی بیاہ کا شوق نہیں ہے۔ کوئی پیام دے یا نہ دے۔ آخر شادی میں اتنا کیا رکھا ہے خاوند کی ناز برداری، اور ذمہ داری کم مصیبتیں ہیں۔ ہم اس جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتے۔ ہم نے مثالیں دیں کہ فلاں فلاں نے شادی نہیں کی ہے اور اطمینان اور مزے سے زندگی گزار رہے ہیں۔ فلاں فلاں نے شادی کی ہے اور ان کی طلاق ہوئی ہے۔ ان کی زندگی اجیرن بنی ہے۔ اسے

بہتر ہے کہ شادی نہ کی جائے۔ لیکن ابو اور امی کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ انہوں نے ہمارے دل کے چور کو پکڑ لیا ہے اور ہم محض ان کا دل رکھنے کے لئے یہ باتیں کہہ رہے ہیں۔

''منجھلی بہن ابھی کہاں ہے؟'' ایک لڑکی نے پوچھا

''ایک عمر رسیدہ آدمی کے ساتھ اس کی شادی ہوئی۔ وہ بتیس سال اس سے بڑا تھا۔ اس آدمی کی بیوی فوت ہوئی تھی اور بڑھاپے میں اس کو ایک خدمت گزار عورت کی ضرورت تھی۔ ابو کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ وہ سبزی منڈی سے سبزیاں لا کر بیچتے تھے۔ اسی سے ہماری گزر بسر ہوتی تھی۔ چھوٹے بھائی بیمار رہنے لگے تھے۔ امی حیات تھیں۔ گھر میں غریبی تھی۔ اور آنے والے دن ہمیں اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ آدمی کھاتا پیتا تھا۔ رخصتی کی رات میری منجھلی بہن بہت روئی۔ میں بھی بہت روئی۔ دو سال بعد اس کا شوہر چل بسا۔ وہ اب اسی گھر میں اس کی بیٹی اور خانہ داماد کے ساتھ رہتی ہے۔''

''چھوٹی بہن کہاں ہے؟'' ایک لڑکی نے پوچھا

''وہ ایک پھیری والے کے ساتھ بھاگ گئی۔ جو ہر سال گرمیوں میں کپڑے، چادر اور قالین اٹھائے فروخت کرنے ہمارے محلے میں آتا تھا۔ ہماری چھوٹی بہن نے بڑی بہنوں کا حشر دیکھا تھا۔ اور وہ اپنے کو شاید غیر محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ ہم نے اس کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اتنا سنا کہ وہ یوپی میں سہارن پور کے پاس ایک گاؤں میں اپنے شوہر اور اس کے والدین کے ساتھ رہتی ہے اور اس کے تین بچے ہیں ایک مرحلے پر ہم خوش ہوئے کہ اس نے ایک لحاظ سے اچھا کیا۔ وہ کنبہ غریب سہی اس نے اپنا گھر تو بسایا۔

جب وہ بھاگ گئی تو ہمارے دور اور نزدیکی رشتہ دار ہمارے گھر آئے اور بولے۔ اس لڑکی نے ہمارے خاندان کے نام پر بٹہ لگایا ہے۔ ہماری ناک کاٹی ہے اور اب ان دو لڑکیوں کو شادی کا کوئی پیام نہیں آئے گا۔

تب میں پینتالیس سال کی ہو چکی تھی۔ منجھلی بہن اڑتیس سال کی تھی۔ ابھی تک شادی کا پیغام نہیں آیا۔ اب پیغام آنے سے رہا۔

''چھوٹا بھائی کب چل بسے؟''

''ان کو فوت ہوئے بیس سال سے زیادہ ہوئے ہیں۔ جب وہ زندگی سے مایوس ہوئے تو انہوں نے دکان کی چیزیں فروخت کیں اور اس کی رقم امی اور مجھے دی۔ وہ بڑے حساس تھے۔ ہمارے کوفت اور محرومی اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ یہ جو سلائی مشین آپ یہاں دیکھ رہی ہیں وہ ان کی خریدی ہوئی ہے۔ اس نے ہم دو بہنوں کو چند ماہ ایک درزی کے پاس رکھا اور ہم نے کچھ سلائی سیکھی۔ وہ ہمارے لئے جئے اور ہماری فکر میں مر گئے۔''

عورت رونے لگی اور سروے کرنے والی دو لڑکیوں کی آنکھوں میں آنسو آئے۔

اور بڑا بھائی؟ اس نے شادی کی اور گھر بسایا۔ ایک روز وہ اس شہر سے چلے گئے۔ اور کہاں گئے۔ ہمیں پتہ نہیں لگا۔ وہ شروع سے ہی گھر کی الجھنوں سے دور رہتے تھے اور ہمیں ایک بوجھ سمجھتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی امی کی خبر لیتے تھے۔ اور مالی مدد بھی کرتے تھے۔ پچھلے دنوں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شہر آئے اور مجھ سے ملاقات کی۔

'آپ اپنے ماضی کو پلٹ کر دیکھیں تو آپ کو کیا محسوس ہوتا ہے؟'' ایک لڑکی نے پوچھا۔

''میری بھی تمنا تھی کہ کوئی مجھے امی کہہ کر پکارے۔ میری چھاتی سے چمٹ کر میرا دودھ پیئے۔ میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہو۔ بڑھاپے میں میرا سہارا ہو۔ میں بیمار ہوں تو میری تیمارداری کرے۔ میں مر جاؤں تو میری یاد میں آنسو بہائے۔ میری اولاد کی ایک نسل چلے اور دادا دادی کو یاد کرے۔ جب ندیم نے مجھ سے محبت کی تو میں نے بہت سارے سہانے سپنے دیکھے تھے۔ مجھے دو بچوں کی تمنا تھی۔ ایک

بڑ کا اور ایک لڑکی۔ حتیٰ کہ میں نے ان کے نام تک سوچا تھا۔ میں نے خیال ہی خیال میں ان کو پال پوس کر بڑا کیا۔ بیٹے کے لئے چاند جیسی ایک خوبصورت دلہن دیکھی اور بیٹی کے لئے ایک اچھا گھر اور ایک وجیہہ اور ذمہ دار شوہر کا خواب دیکھا۔ لیکن یہ سارے خواب آن کی آن میں بکھر گئے اور صرف حسرتیں رہیں۔''

''ندیم سے کبھی ملاقات ہوئی؟''

''کئی مرتبہ آمنا سامنا ہوا۔ اجنبی کی طرح پیش آتا تھا۔ مجھ سے کترا تا تھا اور کنی کاٹ کر نکل جاتا تھا۔ میں نے کبھی شکوہ نہیں کیا۔ شکوہ شکایت کر کے مجھے کچھ ملنا تو نہیں تھا۔''

''آپ نے کبھی گھٹن محسوس کی؟ جیسے محرومی، جنسی ناآسودگی، جلن''

ظاہر ہے۔ میں ان تمام آزمائشوں سے گزری ہوں۔ میں جوانی میں افسانے خاص کر رومانی ناول بہت پڑھتی تھی۔ ناول کے گوناگوں کردار زندگی کے مختلف رخ اجاگر کرتے تھے اور مجھے اپنے اکثر سوالوں کے جواب مل جاتے تھے۔ ان کے سکھ سے مجھے یک گونہ اطمینان اور دکھ سے دکھ ملتا تھا۔''

''ان سنگل مردوں اور عورتوں کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے جو اپنی من مرضی سے اکیلے رہتے ہیں؟''

''اگر آپ کی مراد ان سنگل مردوں اور عورتوں سے ہے جو شادی نہیں کرتے ہیں اور دوسرے عورتوں اور مردوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنی جنسی خواہشات پوری کرتے ہیں تو میں ان کے نظریے سے متفق نہیں ہوں۔ میں ایک مشرقی عورت ہوں ایک آدرش مشرقی عورت جو صرف اپنے شوہر سے جسمانی تعلق رکھتی ہے۔

''آپ اپنی ہم عصر غیر شادی شدہ عورتوں کو کیا پیغام دیں گی؟ جن کی شادی کی عمر ڈھل چکی ہے یا ڈھل رہی ہے؟ لڑکیوں نے سوال کیا۔

عورت کے ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکان آئی ''میں کیا پیغام دے سکتی ہوں۔ زخم خوردہ عورت ہوں۔ ایک زندہ لاش ہوں۔ میرے بال وقت سے پہلے سفید ہو گئے ہیں۔ میرے دانت گر گئے ہیں اور آنکھوں کی بینائی کمزور ہو گئی ہے۔

آپ ان عورتوں کے لئے عملی کام کیجئے۔ ان پر کیا گزرتی ہے ان کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ سماج کو بیدار کیجئے۔ خاص کر جنس مخالف میں احساس پیدا کیجئے۔ اوران عورتوں کو نئی زندگی دیں اوران کا دامن خوشی سے بھر دیں۔''

☆☆☆

ایک انٹرویو کا آخری سوال

۔عبدالغنی شیخ

انٹرویو کے اختتام پر اینکر نے پوچھا۔ ”آپ کو ایک بڑی رقم ملے تو آپ اسے کیسے صرف کریں گے؟“

دس کروڑ، پندرہ کروڑ۔

”میں اس رقم کو ایک انوکھا اور جداگانہ پروجیکٹ پر صرف کروں گا۔ کوئی ایسی فلاحی تنظیم یا ادارہ قائم نہیں کروں گا۔ جو آئے دن ہم دیکھتے ہیں۔ جیسے یتیم خانہ، بیواؤں کے لئے پناہ گاہ، بے سہارا عمر رسیدہ افراد کے لئے اقامت گاہ۔ ایسے فلاحی اداروں کو مخیرّ لوگ مدد کرتے رہتے ہیں۔

اسی طرح اپاہج اور معذور افراد کے لئے میں کوئی مرکز کھولنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہوں۔ سرکار نے اپاہجوں اور معذور لوگوں کے لئے سنٹر کھول رکھے ہیں۔ اور سرکار انہیں کچھ حد تک روزگار کا وسیلہ فراہم کرتی ہے۔

اسی طرح عبادت گاہوں کی کمی نہیں ہے۔ البتہ عبادت گزاروں کی کمی ہے۔“

”تو پھر آپ کا پروجیکٹ کیا ہے؟“

”میں Spinsters کے لئے ایک فلاحی ادارہ کھولنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں۔ وہ لڑکیاں، جن کی عمر شادی کی مروجہ عمر کی حد سے تجاوز کر گئی ہے، ان کو Spinster کہا جاتا ہے۔ میں ان عورتوں کو ازدواجی زندگی دینا چاہتا ہوں اور ان

کو عروسی لباس میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ان کے ہونٹوں پر مسکان لانا ادارے کا اولینفریضہ ہوگا"۔

"بظاہر یہ پیچیدہ مسئلہ لگتا ہے۔کیا آپ نے اس پر سوچا ہے؟"

"ایک سپنسٹر کی مروجہ معینہ عمر مسلمہ نظریہ نہیں ہے۔کوئی کلیہ نہیں ہے۔ یہ انسان کا نام نہاد نظریہ ہے۔مرد اور عورت کی آبادی کا تناسب لگ بھگ برابر ہے۔مرد جب بھی شادی کرتا ہے تو انگلی اُٹھائی نہیں جاتی۔ایک سپنسٹر کی زندگی میں رنگ بھی رنگ وروپ ہوتا ہے۔رعنائی اور دلکشی ہوتی ہے۔اس کی رگ وپے میں زندہ رہنے کی رمق ہوتی ہے۔ شادی کے بعد اس کی رنگ ولبو میں نکھار اور لبوں پر سدا بہار مسکراہٹ آتی ہے۔"

"آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟"

"میرے ذہن میں لمبی مدت سے یہ خیال گھوم رہا ہے۔ یہ بات صحیح ہے۔جن کے پاس وسائل ہوتے ہیں۔ان کے پاس تخیل نہیں ہوتا ہے۔اور جن کے پاس تخیل ہوتا ہے۔ان کو وسائل نہیں ہوتے ہیں۔حال میں اس شہر میں ایک دینی تنظیم نے سپنسٹروں کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کے لئے ایک سروے کیا۔سروے رپوٹ کے مطابق بارہ لاکھ کی آبادی کے اس شہر میں چھتیس ہزار سپنسٹر ہیں۔"

"یعنی سرینگر میں اتنی بڑی تعداد میں سپنسٹر ہیں؟"

جی ہاں، وادی میں کل پچاس ہزار سپنسٹر ہیں۔سروے رپوٹ کے مطابق بہت ساری لڑکیاں اچھے روزگار والے بر جیسے ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ کے انتظار میں اپنا شباب گنوا دیتی ہیں۔ بہت ساری جہیز دینے کی حیثیت نہیں رکھتی ہیں۔ بہتوں کی شادی غریبی کی وجہ سے نہیں ہوتی۔کئی دفعہ دو چاہنے والوں کی شادی ایک چھوٹی سی بات کی وجہ سے اٹک جاتی ہے۔ وقت پر شادی نہ ہونے کی وجہ سے سنگین سماجی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔خودکشی کرتی ہیں۔نشیلی ادویات استعمال کرتی ہیں۔اخلاقی بے راہ روی

اور ماورا شادی جنسی تعلقات کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔'' ''گویا یہ سروے رپوٹ آپ کے لاشعور میں چھپے منصوبے کا محرک ہے؟''

''نہیں۔ اور بھی محرکات ہیں۔ شادی زندگی کا ایک اہم ترین فریضہ اور حسین ترین ضرورت ہے۔ ہر لڑکا اور لڑکی سن بلوغت حاصل کرنے سے پہلے اپنے من پسند شہزادی اور شہزادہ کا خواب دیکھتے ہیں۔ خاص کر ایک لڑکی اپنے پریتم کے لئے خوبصورت سپنے بُنتی ہے۔ من ہی من میں ایک نیا گھر بساتی ہے۔ جہاں وہ ہے اور اس کا محبوب ہے۔ ان کے من موہنے بچے ہیں۔ جن کی کلکاریوں سے گھر میں رونق ہے۔ اس کے سپنوں کا شہزادہ مردانگی کا پیکر ہے اور وجاہت میں ہزاروں میں ایک ہے۔ جو اس کو ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس کے سامنے دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی کے روپ میں پیش کرنے کے ءلئے کوشاں رہتی ہے۔ اس کی جدائی صبر آزما ہوتی ہے۔ اور اس سے ملاقات اس کی زندگی کے خوبصورت ترین لمحات ہوتے ہیں۔ اس کی یادیں اس کے لئے سب سے بیش قیمت سرمایہ ہوتی ہیں۔ جب کسی کے دل میں کسی کی محبت اپنی جگہ بنا لیتی ہے تو اس کے جیون میں یک لخت بڑی تبدیلیاں آتی ہیں۔ دنیا کے ہر ملک کی زبان اور ادب رومانی گیتوں اور نظموں سے مالا مال ہیں۔ صرف اردو کو لیجئے، ہجر، وصل، انتظار، شباب، یادیں، وعدے جیسے موضوعات پر ہزاروں اشعار ہیں۔ محبوب اور محبوبہ کی آنکھوں، زلف، لب و رخسار، سرو قد، کمر، صراحی دار گردن اور موتی جیسے دانتوں پر شعرو شاعری کا خزانہ ہے۔ محبت دنیا کا سب سے طاقت ور جذبہ ہے۔ محبت نے لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، رومیو جولیٹ اور شیریں فرہاد جیسی امر اور زندہ جاوید داستانوں کو جنم دیا ہے۔ آئے دن ایسی خبریں سنتے اور پڑھتے ہیں کہ جب دو محبت کرنے والوں کی راہ میں سماج حائل ہوتا ہے اور ملن کی کوئی کرن نظر نہیں آتی ہے تو ان کی آنکھوں کے سامنے دنیا اندھیر ہو جاتی ہے اور دونوں

موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ انسان تو انسان ہر جاندار میں محبت کا جذبہ ہوتا ہے۔ چکوری چاند دیکھ کر ناچتی ہے اور پتنگا شمع پر اپنی جان دیتا ہے۔

آپ اس سپنسٹر کے بارے میں سوچیئے۔ جس نے برسوں خواب دیکھے ہیں۔ ایک روز وہ اپنے لمبے سیاہ گیسو میں چند سفید سفید تاریں دیکھتی ہے۔ اس کے دل میں ہوک سی اُٹھتی ہے اور اس کا خواب چکنا چور ہو جاتا ہے۔

"آپ اس پروجیکٹ کو کیسے چلائیں گے؟"

"میں پندرہ کروڑ کی رقم بنک میں جمع کروں گا۔ اس سے جو منافع ہوگا۔ اسی رقم کو اہل کاروں کی تنخواہ، دفتر کا کرایہ، شادی کی تقریبات، ہنگامی ضروریات، سروے کرنے والوں کی ایک دو گاڑیوں وغیرہ کے اخراجات پر صرف کروں گا۔ جو بچت ہو وہ حسب توفیق حاجت مند جوڑوں کی معاشی ضروریات کے لئے خرچ کیا جائے گا۔ تعلیم، ہنر، اور اہلیت کے مطابق روزگار دلانے کی کوشش ہوگی۔ چھوٹے موٹے کاموں کی تربیت دی جائے گی۔ ان جوڑوں میں سماج کے مختلف طبقوں کے افراد جیسے بساطی، پھیری والا خوردہ فروش اور رکشا چلانے والا ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ کئی دفعہ ایک چھوٹی بات پر شادی اٹکی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کو جانچنا، پرکھنا اور حل نکالنا ادارہ کا کام ہوگا۔

"اس کے لئے آپ کو اچھے اہل کاروں کی ضرورت پڑے گی۔"

"آپ نے صحیح کہا۔ اہل کار مخلص، بے لوث اور صادق ہوں گے۔ ان کا دل انسانی محبت اور ہمدردی سے لبریز ہوگا۔ آدھے اہل کار خواتین ہوں گی کیوں کہ ایک عورت دوسری عورت کے جذبات واحساسات کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہے۔ مختصراً ایک اہل کار کی سوچ ادارے کی سوچ اور آئین کے مطابق ہونی لازمی ہوگی۔

"کیا آپ کی سرگرمیاں اسی شہر تک محدود رہیں گی؟" "ادارہ ایک لبارٹری کا

کام کرے گا۔ اگر یہ تجربہ گاہ کامیاب رہی تو اس کا اطلاق دوسرے شہروں میں ہو سکتا ہے۔ میں نے پڑھا ہے۔ ہمارے ملک میں دو لاکھ کروڑ پتی ہیں۔ دو سو ارب پتی اور کھرب پتی ہیں۔ اگر ان میں چند اس مسئلے کی افادیت کو سمجھ لیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے اور دوسرے شہروں اور علاقوں میں ایسے ادارے کھل سکتے ہیں۔ میں اپنی بساط کے مطابق کام کروں گا۔ اس شہر کے بعد اپنے قصبے کا رخ کر سکتا ہوں جہاں یہ مسئلہ سنگین نہ سہی پر اپنا سر اُٹھا رہا ہے۔ اگر تجربہ کامیاب رہا تو مخیّر لوگ مدد کے لئے آگے آ سکتے ہیں۔ اس ملک میں ڈھلتی عمر نے لاکھوں لڑکیوں کی زندگی کی معنویت چھین لی ہے۔ اہلِ فکر و نظر کے لئے یہ ایک بڑا چیلنج ہے کہ اسے پہلے کہ جوانی کی دہلیز پر کھڑی لڑکیاں اپنی عمر کی حدیں پھاند لیں ان کو ایک نئی زندگی دی جائے۔''

''آپ نے شادی کی تقریب کی بات کی۔ وہ کیسے ہوگی؟''

''تقریب بالکل سادہ ہوگی اور اجتماعی ہوگی۔ جس میں بیک وقت سو جوڑے تک حصہ لے سکتے ہیں۔ ہر جوڑا اپنے عقیدے کے مطابق نکاح، پھیرا یا مروجہ طریق کار اختیار کرے گا۔ البتہ نمود و نمائش اور ٹیپ ٹاپ سے احتراز کیا جائے گا جس میں فضول خرچی ہوتی ہے۔''

''آپ کی کوئی اور خواہش ہے؟''

''اس کے لئے آپ مجھے کتنی رقم دے رہے ہیں؟''

''یہیں دس یا پندرہ کروڑ روپے۔ کیا اسے زیادہ رقم چاہئے؟''

''نہیں یہ بالکل کافی ہے۔ آپ اپنی دوسری خواہش بیان کیجئے''

اردو کے اچھے اچھے رسائل یکے بعد دیگرے دم توڑ رہے ہیں۔ چند بند ہوئے ہوئے۔ رسائل کو از سرِ نو اجرا کرنا چاہتا ہوں۔ ان بند ہوئے رسائل میں شمع میگرین کے نام سے ایک خاندان کئی رسائل کی ادارت کر رہا تھا۔ شمع۔ بانو، شبستان،

کھلونا، مجرم اور آئینہ نام کے رسایل، صوری اور معنوی طور اعلا معیار کے تھے۔
خاص کر شمع، کا بڑا چرچا تھا۔ یہ فلمی جریدہ تھا۔ تاہم اس میں معیاری کہانیاں اور نظمیں
چھپتی تھیں۔ شمع کی اشاعت ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ لیہ کی آبادی جب دس ہزار سے
زیادہ نہیں تھی "شمع" کے ڈیڑھ سو شمارے لیہ آتے تھے اور سبھی فروخت ہوتے تھے۔ شمع
میں تخلیق چھپنا باعثِ افتخار سمجھا جاتا تھا۔ اس خاندان کے سرپرست یوسف دہلوی نے
غریبی اور کسمپرسی کے عالم میں یہ کثیرالاشاعت رسالہ اجرا کیا تھا۔ شمع، بانو اور کھلونا میں
میری کہانیاں اور گاہے اکا دکا مضامین شائع ہوتے تھے۔ میں شبستان میں بہت کم لکھتا
تھا۔ ادارہ تخلیقات کی اشاعت کے لئے معاوضہ دیتا تھا۔

شمع کا دفتر دہلی میں آصف علی روڈ پر تھا۔ جب بھی مجھے دہلی جانے کا اتفاق ہوتا
میں شمع کے دفتر ضرور جاتا تھا۔ دربان جھٹ اندر لے جاتا اور شمع کے مدیر یونس دہلوی
مجھے بلا لیتے۔ خندہ پیشانی سے پیش آتے اور چائے سے نوازا کرتے تھے۔ ایک بڑے
ہال میں یونس صاحب اور ان کے برادران ادریس دہلوی اور الیاس دہلوی اور کاتبان
رہتے تھے۔ اسی ہال سے ایک ملحقہ کمرے میں یونس صاحب کی صاحبزادی سعدیہ
دہلوی رہتی تھی۔ وہ بانو کی مدیرہ تھی جو خواتین کا مقبول جریدہ تھا۔ بانو کے پہلے صفحے پر
بہ یادگار یوسف دہلوی لکھا ہوتا تھا اور سعدیہ کی والدہ زینت کوثر دہلوی کا نام بطور مدیرہ
اعزازی اندراج ہوتا تھا۔ میں سعدیہ سے بھی ملاقات کرتا تھا۔ کھلونا کے مدیر الیاس
دہلوی تھے۔ یہ بچوں کا مقبول جریدہ تھا۔ کھلونا پر اس کے بانی یوسف دہلوی کا نام لکھا
ہوتا اور مدیران اعزازی کی حیثیت سے یونس دہلوی اور ادریس دہلوی کے نام بھی
دیئے ہوتے تھے۔ ادریس دہلوی شبستان کے مدیر تھے، اس کے ساتھ یونس دہلوی
بطور نگران یوسف دہلوی کے نام بھی دئے ہوتے تھے۔ شبستان میں معلوماتی مضامین،
مجرم میں جاسوسی مضامین، اور آئینہ میں حالات حاضرہ کے علاوہ دلچسپ

معلومات شائع ہوتی تھیں۔ یونس دہلوی برادر اکبر تھے۔

شمع میں ہر ماہ ایک کہانی بلا عنوان چھپتی تھی۔ کہانی کار کے عنوان کو پوشیدہ رکھا جاتا تھا۔ ادارہ قارئین سے اپنا پسندیدہ عنوان دینے کے لئے فرمائش کرتا تھا اور اس کے لئے اول، دوم اور سوئم تین انعامات رکھے جاتے تھے۔ ہر ماہ ہزاروں قارئین اپنے پسندیدہ عنوانات بھیجتے تھے۔ میری کئی کہانیاں بلا عنوان چھپی ہیں۔ میری ایک کہانی ۱۱۹ قارئین کے بھیجے ہوئے عنوانات کا ہم عنوان نکلا۔ دوسری کہانی کا عنوان اسے کہیں زیادہ قارئین کے بھیجے ہوئے عنوانات سے ملتا تھا۔ عنوانات کے لئے شمع نے اپنی کسوٹی تعین کی تھی۔ جو عموماً کہانی کار کے عنوان سے میل نہیں کھاتی تھی۔

ان رسائل کا بند ہونا اردو کے لئے ایک بڑا دھکا ہے۔ اگر اس کی تلافی ہو تو اردو دانوں کے لئے نوید جانفزا ہے۔

میں رسالے میں چھپنے والی تخلیقات کے لئے ایک جداگانہ معیار تعین کروں گا۔"

"وہ کیا ہوگا؟"

"بہترین کہانیاں اور نظمیں شائع ہوں گی۔ جنہیں علاقائی زبانیں ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی زبانوں میں ترجمہ کرنے کرانے میں متعلقین پسندیدگی اور دلچسپی کا مظاہرہ کریں گے۔ اس سلسلے میں ادیب کو اس کی تخلیق کے لئے معقول معاوضہ دیا جائے گا۔"

"کتنا معاوضہ دیں گے؟"

"ایک کہانی کے لئے دس ہزار روپیہ حقِ محنت دیا جائے گا۔ ایک غزل اور نظم کا محنتانہ بھی معقول ہوگا۔"

"خیال اچھا ہے۔" "کیا عمل آوری بھی ہوگی"

'ایک اچھی تخلیق کے لئے خونِ جگر دینا پڑتا ہے۔ جب قلم کار کی قدردانی ہوگی تو وہ ریاضت بھی کریں گے۔ مجلس ادارت میں قد آور، پختہ کار ادیب ہوں گے اور

مجلس مشاورت کے لئے مخلص، بے لوث اور معروف ادبی شخصیتوں کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ مجالس مشاورت اور ادارت کے ارکان ادارہ کے قواعد وضوابط کے پابند ہوں گے۔

''آپ کی ان ادبی سرگرمیوں کا مرکز کہاں ہوگا؟''

''ہم راجدھانی میں ایک بڑی عمارت کرایہ پر لیں گے۔آ گے جا کر شاید ہم ایک مرکز تعمیر کر لیں۔''

''آپ کے تخیل کی اڑان بڑی اونچی ہے لیکن یہ سوالیہ نشان اپنی جگہ قائم ہے کہ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟''

''زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اردو گنگا جمنی تہذیب کی علامت اور ہندو مسلم مشترکہ ثقافت کا ورثہ ہے۔ نام تو بہت سارے ہیں۔ اگر عظیم جی، پریم جی، خواجہ محمد یوسف یا محمد علی جیسے مسلمان ارب پتی اس طرف تھوڑا سا دھیان دیں تو یہ اردو کی ترقی اور بقا کا ضامن ہے۔''

''آپ نے اپنی ذاتی خواہش کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ چچا غالب نے کیا خوب کہا ہے

''ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے''

''مجھے ہزاروں خواہشیں نہیں ہیں۔ میں نے اپنی دو خواہشوں کا ذکر کیا ہے البتہ مجھے سیاحت کا شوق ہے۔میں نے بارہ ملکوں کی سیاحت کی ہے۔جن میں سات یورپ چار ایشیا اور ایک لاطینی امریکہ میں ہے۔ ایک لاطینی میں ہے۔میں نے قارئین کو اپنا سفرنامہ دیا ہے۔اگر اس پیرانہ سالی میں اور سفر کا موقعہ ملے تو قارئین کو اپنے مشاہدات اور تجربات میں شریک کار بناؤں گا

دوراہا

عبدالغنی شیخ

پاپا ممّی سے کہہ رہے تھے: ''ماورا کے لئے کوئی لڑکا دیکھنا چاہیئے۔ کبھی کبھی اکلوتی لڑکی بھی پریشانیاں لاسکتی ہے۔''

اس پر ممّی بولیں۔ ''کوئی موزوں لڑکا نظر ہی نہیں آتا۔''

میرے قدم دہلیز پر رک گئے۔

''آج کل ہر میدان میں لڑکیاں لڑکوں سے آگے ہیں'' یہ پھر ممّی کی آواز تھی۔

''میری نظر میں دو تین لڑکے ہیں۔'' پاپا بولے۔

میرا دل دھڑکنے لگا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ چھپ کر باتیں سننا بڑا عیب ہے، میری ٹانگیں اپنی جگہ سے نہیں ہلیں اور میں دیوار سے چپک کر اپنے بارے میں پاپا اور ممّی کی باتیں سننے لگی۔

''بھلا کون ہیں وہ لڑکے۔؟'' ممّی نے سوال کیا۔

''ایک تو رضوان ہے۔''

''رضوان؟ نہ پاپا۔'' میرے دل نے خاموش احتجاج کیا۔

''رضوان نے تو دل افروز کو پیام دیا ہے۔'' ممّی بولیں۔

''یہ ہم ایک سال سے سن رہے ہیں۔'' پاپا نے کہا۔ ''کل ہی طفیل احمد کہہ رہا تھا کہ رضوان کے لئے انہوں نے کسی کو پیام نہیں دیا ہے۔''

دل افروز کی ماں سب کے سامنے کیا کہہ رہی ہے؟'' ممّی نے سوال کیا۔

’’اپنی لڑکی کی قدر و قیمت بڑھانے کے لئے کچھ لوگ غلط باتیں کہہ دیتے ہیں۔‘‘

’’عاصم کے بارے میں کیا خیال ہے؟‘‘ پاپا نے سوال کیا۔

’’پاپا، کن کے نام لے رہے ہیں؟‘‘ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

ممّی بولیں ’’جمیلہ ایک روز کہہ رہی تھی کہ ہمارا عاصم بڑا افسر ہے۔ ہر طرف سے پیغامات آرہے ہیں لیکن عاصم ہے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔‘‘

’’ان الفاظ سے نخوت کی بو آتی ہے۔‘‘ پاپا بولے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔ ’مریم‘ دراصل یہ سب جہیز کا چکر ہے اور ہم جہیز دے نہیں سکتے۔‘‘

’’لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ایک لڑکی کی تعلیم پر بھی بڑا خرچ آتا ہے۔‘‘ ممّی کی آواز میں گہری تلخی تھی۔ ’’برسر روزگار لڑکی بھی چاہئے اور جہیز بھی بے کار ہے تو بھی پریشانی، روزگار ہے تو بھی پریشانی۔‘‘

میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔

’’ماورا کے ہاتھ پیلے ہو جائیں تو ہمارے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے ممّی کی آواز گلوگیر ہوگئی اور میرے دل کی ٹیس اور بڑھ گئی، لیکن میرے چہرے پر درد کی پرچھائیوں کو دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔

’’لڑکا تو حامد بھی اچھا ہے۔‘‘ پاپا اچانک بولے۔ ’’دونوں ایک ساتھ پڑھے لکھے بھی ہیں۔‘‘

’’حامد کے ماں باپ بھی شریف ہیں۔‘‘ یہ ممّی کے الفاظ تھے۔

’’لیکن......‘‘ پاپا یہ کہہ کر رک گئے۔

’’لیکن کیا؟‘‘ ممّی نے پوچھا۔

’’معلوم نہیں ماورا پسند کرے یا نہ کرے۔‘‘

’’پاپا، حامد مجھے پسند ہے‘‘ میرے لب وا ہوئے اور میں نے دل کی گہرائیوں سے

نکلی ہوئی خاموش آواز سن لی۔

''آخر لڑکی بھی تو چاہتی ہے کہ اس کا شوہر ملازمت میں اس کے ہم پایہ ہو۔'' پاپا نے کہا۔

''نہیں پاپا، یہ بات نہیں، میرے دل نے چپکے سے کہا۔''

''حامد نیک لڑکا ہے۔ برسرروزگار ہے۔ کوئی کمی تو نہیں۔'' ممّی بولیں۔

''ہاں، ایم اے کیا ہے۔ چار پانچ سال تک سنیئر ٹیچر یا لیکچرار لگ سکتا ہے۔'' پاپا بولے۔

مجھے پاپا اور ممّی پر ترس آنے لگا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جی چاہا کہ ان کے پاس جاؤں اور ان کی دل جوئی کروں۔

''ماورا کہاں گئی؟'' پاپا نے گفتگو کا رخ یک لخت پلٹ دیا۔

''طلعت کے ہاں گئی ہے۔'' ممّی بولیں۔

میں گھبرا گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے پاپا نے چوری چھپے باتیں سنتے ہوئے مجھے پکڑ لیا ہے۔ دہلیز کے ساتھ نیم تاریک راہ داری تھی۔ جو بائیں طرف خم دار سیڑھی کے پاس جا کر ختم ہوتی تھی۔ میں نے راہداری کی لمبائی اپنی آنکھوں سے ناپ لی۔ سیڑھی چڑھتے ہوئے کسی کے پیروں کی چاپ آسانی سے سنی جا سکتی تھی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی وسیم اور ندیم کے اسکول سے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ ادھر پاپا ممّی کے دروازہ کھولنے سے پہلے میں ایک ہی جست میں راہ داری کی سیڑھی تک پہنچ سکتی تھی، لیکن وہ باتیں کرنے میں اتنے مصروف تھے کہ اچانک ان کے باہر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

''کیا بجا ہے؟'' ممّی نے پوچھا۔

''تین بجے ہیں۔''

''ماورا آ رہی ہوگی۔''

''تم ماورا سے شادی کی بات کا ذکر نہ کرنا'' پاپا بولے۔''خواہ مخواہ پریشان ہو جائے گی۔''

میری سراسیمہ نظریں پھر ایک دفعہ راہ داری کی آخری حد تک جا کر رک گئیں۔

''ماورا کا ایک ہفتہ کسی ٹینشن کے بغیر گزرنے دو۔'' پاپا نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔''ٹریننگ ختم ہونے دو۔سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔خدا کارساز ہے۔'' پاپا نے ممّی کو دلاسا دیا۔

تھوڑی خاموشی رہی۔پاپا پھر ایک دفعہ تاکید کرتے ہوئے بولے۔''مریم،تم اس کے سامنے ہماری بات چیت کا بالکل ذکر نہیں کرو گی۔''

''چینی ختم ہوگئی ہے۔بازار جاؤ تو لے آنا۔'' ممّی بولیں۔

''میں جاتا ہوں۔'' پاپا جواب میں بولے۔

بلی کی چال چلتے ہوئے میں نے تیر کی طرح راہداری طے کی اور خم دار سیڑھی کو پھلانگتے ہوئے گلی میں آ گئی۔نکڑ پر چچا اشرف کی دکان سے ایک چیونگ گم خرید کر مونہہ میں ڈال کر چبانے لگی۔میرا دل اس انکشاف سے بڑا خوش تھا کہ پاپا اور ممّی کے دل میں حامد کے تئیں نرم گوشہ ہے۔

حامد اور میں کالج میں کلاس فیلو رہے تھے۔بی اے کرنے کے بعد ہم نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔وہ پڑھائی میں مجھ سے بہتر تھا اور کئی دفعہ اس نے پڑھائی میں میری مدد کی تھی۔

''ماورا، جو بھی کام ہو، مجھے بے جھجک بتا دیا کرنا۔'' ایک روز حامد بولا۔

اس کے چہرے پر آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں۔ان اداس اداس، پراسرار آنکھوں میں ہمیشہ ایک سوال چھپا ہوا ہوتا تھا اور ہمیشہ کسی چیز کی متلاشی تھیں۔

............''میں تمہارے کہے بغیر بھی کام لیتی رہتی ہوں، حامد'' میں نے جواب دیا۔

''کسی اور سے کام کے لئے نہ کہنا۔''

''کسی اور سے نہ کہنا! کسی اور سے نہ کہنا! کسی اور سے نہ کہنا!'' حامد کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔

''کسی اور سے کیوں نہ کہوں؟'' میں نے پوچھا۔

اس کا چہرہ شفق گوں ہوگیا۔ ایسے میں اس کی آنکھیں مجھے اور زیادہ خوبصورت لگیں۔ وہ خاموش رہا تو میں نے پوچھا۔ ''میرے سوال کا جواب نہیں دو گے؟''

''مجھے تمہارے لئے کام کرنا اچھا لگتا ہے۔ اس نے معصومیت سے کہا۔''

''اچھا جی! کل سمپوزیم کے لئے مجھے زبیر سے تقریر لکھوانی ہے۔ تم جانتے ہو، زبیر ہمیشہ ڈیبیٹ میں فرسٹ آتا ہے، اور تم سیکنڈ یا تھرڈ سے اوپر کبھی نہیں گئے۔ میں اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ ہر کام موزوں آدمی سے ہی لینا چاہئے۔''

وہ چند لمحوں کے لئے خاموشی سے میرا مونہہ تکتا رہا اور پھر بولا۔

''میں بھی ڈیبیٹ میں فرسٹ آسکتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کر چلا گیا۔

اگلی دفعہ وہ سچ مچ ڈیبیٹ میں اوّل آیا اور زبیر کا نمبر دوسرا رہا۔ اس روز اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی، لیکن اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔

''اب میں اپنی تقریر صرف تم سے ہی لکھوایا کروں گی۔'' میں نے اس کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

پھر وہ ڈیبیٹ میں ہمیشہ اوّل آتا رہا اور مجھے بھی اس کا تعاون حاصل ہوتا رہا۔ اس کے ساتھ اس کے رویہ میں کچھ تبدیلی آئی۔ پہلے اس کے پیار میں ایک التجا ہوتی تھی، اب اس میں ایک تحکم کی آمیزش بھی ہوئی۔

''ماورا! تم یہ نہیں کروگی۔ وہ نہیں کروگی۔''

''تم مجھے حکم دینے والے کون ہوتے ہو؟'' میں نے ایک روز احتجاج کیا۔

اس دوران زبیر نے مجھے نوٹ لکھنے کے لئے اپنی مدد کی پیشکش کی تھی، لیکن میں حامد کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھی۔

ایک روز میں نجمہ کے ساتھ یونیورسٹی کے لان میں ٹہل رہی تھی تو پیچھے سے زبیر کی پاٹ دار آواز سنائی دی۔

''اسلم، ایک خوبصورت لڑکی کی فرمائش ٹالنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ ماورا نے ایک نوٹ لکھنے کے لئے دیا ہے۔''

میں نے کنکھیوں سے دیکھا۔ زبیر یہ بات دراصل حامد کو سنانے کے لئے کہہ رہا تھا، جو لان کے ایک کنج میں بیٹھا مطالعہ کر رہا تھا۔

''یار، ماورا آج کل قیامت ڈھا رہی ہے۔'' زبیر نے اونچی آواز میں کہا۔

میں شرم کے مارے گڑی جا رہی تھی۔ ہم فوراً وہاں سے چل پڑیں۔

شام کو حامد میرے پاس آیا۔

''تم نے زبیر سے کیوں نوٹ لکھوایا؟''

''میں نے کوئی نوٹ نہیں لکھوایا۔ وہ صرف تم کو چڑا رہا تھا۔''

یہ بات سن کر اسے اطمینان ہو گیا۔

''ماورا، میں نے کالج میگزین کی ادارت سنبھال لی ہے۔''

''مبارک ہو!''

''تم بھی کچھ لکھو۔''

''تم جانتے ہو، مجھے لکھنا نہیں آتا۔''

،بھئی، لکھوں گا میں۔ تم کیا لکھنا چاہتی ہو؟ افسانہ، تنقید یا مضمون؟،...... اپنا فوٹو

دینا نہ بھولنا!''

ایک روز صبح اس نے میرے ہاتھ میں ایک گلدستہ تھما دیا۔ کمرے میں سپیداور سرخ گلاب کی مہک پھیل گئی۔

''کس خوشی میں یہ گلاب لائے ہو؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''آج تمہارا برتھ ڈے ہے۔''

''اوہ! مجھے تو بالکل یاد نہیں رہا۔''

''تمہیں کب یاد رہتا ہے؟''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں کئی دفعہ ضروری پروگرام بھی بھول جاتی تھی اور وہ مجھے یاد دلایا کرتا تھا۔

یونیورسٹی سے فارغ ہو کر ہم دونوں اسٹیٹ ایڈمنسٹریٹو سروس کے امتحان میں شامل ہوئے۔ رضوان اور میں سلیکٹ ہوئے اور حامد رہ گیا۔ حالانکہ یونیورسٹی میں وہ ہمیشہ ہم سے زیادہ نمبر لیتا تھا۔ لیکن انٹرویو میں وہ کامیاب نہیں ہوا۔ اپنے عہدے پر جوائن کرنے کے ایک ہفتہ بعد مجھے دوسرے شہر میں چھ ماہ کے لئے ٹریننگ کے لئے بھیجا گیا۔ اس دوران حامد ایک سرکاری سکول میں ٹیچر ہو گیا۔ میری روانگی سے پہلے وہ مجھے ملنے آیا۔

''ماورا، آج تم اچھے عہدے پر ہو۔ میں تمہیں اب بھی جی جان سے چاہتا ہوں، لیکن آج مجھے تمہارے پیار کا یقین چاہئے۔''

''یہ اب بھی چاہنا کیا ہوتا ہے؟'' کا سوال میری زبان پر آ کر رہ گیا۔

گرے کلر کے سوٹ اور اسی سے میچ کرتی ہوئی ٹائی میں وہ بڑا اسمارٹ نظر آرہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اس کو چھولوں، اس کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر اس کی دلکش آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہوں:'' حامد، میں نے ہر سانس میں تمہیں بسالیا ہے۔

تمہارے بغیر ایک پل بھی میں جی نہیں سکتی۔'' لیکن دل کے الفاظ زبان تک نہیں آئے اور مجھے اس کو چڑانے کی سوجھی۔

''حامد، بہتر ہے کہ اب تم میرے چپراسی بن جاؤ۔''

''ماورا! مجھے بھونڈا مذاق پسند نہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''خدارا، احساس کمتری کا شکار نہ ہو حامد، میری محبت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔'' میں جذباتی ہوگئی۔

لیکن میں یہ بات پاپا اور ممّی کے سامنے نہیں کہہ سکی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا، کاش میں ان سے کہہ سکتی کہ حامد آپ کی ہی پسند نہیں، میری بھی پسند ہے۔ میں تو ازل سے حامد سے پیار کر رہی ہوں۔ کاش ممّی ہی میرے سامنے اس بات کو چھیڑتی اور میں ان کی ساری پریشانیاں دور کر دیتی۔ لیکن ممّی کیسے بولتیں۔ پاپا نے پہلے ہی ان کی زبان پر تالا لگا رکھا ہے۔ مجھے کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تھی۔

ایک ہفتہ گزرنے میں کوئی دیر نہیں لگی۔ اس درمیان ایک روز پہلے حامد مجھے ملا۔

''تم کل جا رہی ہو۔؟''

''ہاں۔''

''خط لکھتے رہنا...... لکھو گی نا؟''

اچانک مجھے اپنی الجھن سلجھتی نظر آئی۔ ''حامد، اپنی ماں کو آج ہی شام ممّی سے ملواؤ تاکہ وہ ہماری بات پاپا اور ممّی تک پہنچا دیں۔''

اس شام کو جب میں اپنی سہیلی طلعت کے گھر سے لوٹی تو حامد کی ماں ممّی کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ میں گربہ چال چلتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ جب میں بیٹھک کے سامنے سے گزری تو ممّی حسبِ عادت چہکتے ہوئے کہہ رہی تھیں: ''اگر ماورا خوش ہو تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے، عائشہ۔''

جب حامد کی ماں چلی گئیں تو پاپا اور ممّی دیر تک سر گوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔

رات کا کھانا ہم سب نے خاموشی سے کھایا۔ کھانا کھا کر میں اپنے کمرے میں آئی اور اس سوچ میں دیر تک جاگتی رہی کہ ممّی اب آئیں گی، اب آئیں گی اور حامد کی ماں کا پیام سنائیں گی، لیکن وہ نہیں آئیں اور نہ ان کا بلاوا آیا۔ انتظار کرتے کرتے مجھے نیند آ گئی۔

صبح کو ناشتے سے جلدی فارغ ہو کر میں اپنا مختصر سامان سوٹ کیس میں ڈالنے لگی۔ مجھے صبح کے پلین سے جانا تھا۔ جب میں نے ممّی سے رخصت لی تو وہ بولیں۔

''کل حامد کی ماں آئی تھیں۔''

''جی۔''

''وہ حامد کے لئے تمہارا ہاتھ مانگ رہی تھیں۔''

''جی''

''ہم نے کہا، اگر ماورا کو رشتہ منظور ہو تو ہمیں بھی اس کی قبولیت میں خوشی ہو گی۔''

میری نگاہیں بے ساختہ جھک گئیں۔

☆☆☆

۔۔۔۔کے دن تھے۔ ابھی انہیں بہت کام کرنا تھا۔ ان کے سامنے لکھنے اور چھپانے کے لئے لمبے چوڑے منصوبے تھے۔ پریمی کی غیر مطبوعہ تصانیف میں سپنوں کی شام، (افسانوں کا مجموعہ) مشاہیر ادب کے خطوط، پریم ناتھ پردیسی۔ شخص اور فنکار، اور منٹو کتھا شامل ہیں جن کو ان کے ہونہار بیٹے ڈاکٹر پریمی رومانی نے منظر عام پر لایا۔ وہ اپنے والد کی شخصیت اور فن پر درج ذیل کتابیں شایع کر چکے ہیں، برج پریمی۔ ایک مطالعہ، برج پریمی شخصیت اور فن، برج پریمی۔ حیات اور ادبیات وغیرہ شامل ہیں

برج پریمی کے بے وقت انتقال کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ مجاز، منٹو، چیخوف، شیلے، چکبست، شمیم جیسے نہ جانے کتنے سارے شاعر اور ادیب کو وقت سے پہلے موت نے چھین لیا۔ موت اٹل ہے۔ اسے مفر نہیں لیکن جب ایک فن کار جوانمرگی کا شکار ہوتا ہے یا وقت سے پہلے موت سے ہمکنار ہوتا ہے تب بڑی کوفت ہوتی ہے۔ مرنے والے کی زندہ تخلیقات ہی یاد نہیں آتیں بلکہ اس تصوراتی اور قیاسی تخلیقات کا حسرت ناک خیال بھی آتا ہے جس کا سوتا مصنف کی موت کے ساتھ سوکھ جاتا ہے۔

☆☆☆

حوا کی بیٹیاں

عبدالغنی شیخ

قبل مسیح :کنفیوشس جیسے بڑے سماجی مصلح نے کہا تھا سو عورتیں بھی واحد خصیہ (مردانگی) کے مد مقابل نہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایک مرد سو عورتوں پر بھاری ہے۔

چین کا ایک بادشاہ چائین یونگ رات ایک عورت کے ساتھ گزارتا تھا اور صبح شاہی حکم سے اس عورت کو ہلاک کیا جاتا تھا۔ حوا کی وہ بدنصیب بیٹی جانتی تھی کہ اس سیاہ رات کی تاریکی کے بعد وہ دوبارہ کبھی صبح کا اجالا نہیں دیکھے گی۔ بادشاہ کی سفاکانہ شہوت نفسانی کو اس سے تسکین ملتی تھی۔ شہنشاہ کے ایجنٹ سلطنت کے گوشے گوشے سے حسین لڑکیاں دارالخلافہ بھیجتے تھے۔ بارسوخ لوگ اپنے اثر ورسوخ سے اور امیر لوگ اپنی دولت کے بل بوتے رشوت دے کر اپنی بیٹیوں کی عزت اور زندگی بچانے کے لئے کوشش کرتے تھے۔

ایک روز کانسو صوبہ کے چونگدی قصبہ کے سرکاری ایجنٹ نے امبان (حاکم) کو اطلاع دی کہ ان کی نظر میں ایک لڑکی ہے، جو ہزاروں میں ایک ہے۔ اس لڑکی کا نام وین چائینگ تھا۔ سیاہ گیسو کے ہالے میں ان کا بیضوی چہرہ چاند جیسا لگتا تھا۔ اس کے پیر چھوٹے چھوٹے تھے، جو چین میں حسن کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ وین چائینگ کے ماں باپ اپنی بیٹی کو شاہزادی کہتے تھے۔ اس کے بہت سارے چاہنے والے تھے تاہم وہ لہسون سے محبت کرتی تھی۔ لہسون ایک منجھا ہوا کاریگر تھا۔ دونوں نے اگلی بہار میں شادی کرنے کا فیصلہ تھا۔ ایک روز لہسون کے کانوں میں بھنک پڑی کہ سرکاری ایجنٹ کی نظریں وین چائینگ پر ہیں۔ تب سے وہ سہمی سہمی زندگی گزارنے لگی۔ رات

وہ کسی سہیلی یا رشتہ دار کے گھر گزارتی۔ ایک رات وہ اپنی خالہ کے پاس تھی۔ سہ پہر رات سرکاری ایجنٹوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس سے پہلے کہ ایجنٹ اور سپاہی مکان کو گھیرے میں لیں، وہ عقب کے باغیچے سے لہسون کے گھر بھاگ گئی۔ سپاہیوں نے اس کا پیچھا کیا۔ لہسون نے اپنی کاریگری کے چھوٹے اوزار سے مدافعت کی لیکن سپاہیوں کے سامنے اس کی کچھ نہیں چلی۔ ایک سپاہی نے اس کے سینے میں خنجر بھونک دیا۔ اس کے بعد وین چائینگ کا کیا حشر ہوا، یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بعد مسیح: یونانی اساطیر (مائتھولوجی) میں ایک خیالی عورت پنڈورا کو تمام انسانی مصائب کا موجب قرار دیا گیا تھا۔ اور تو اور ارسطو جیسے بڑے فلسفی کا یہ قول تھا کہ عورت جسمانی طور پر ایک ناقص مرد کے مشابہ ہے۔ قدیم روم میں برہنہ عورتوں کو دوڑ کے مقابے میں حصہ لینا پڑتا تھا۔ جس سے مردوں کی شہوت بھری بھوکی نگاہوں کو تسکین ملتی تھی۔

شاہ آگسٹس کو سڈول بدن کی عورتیں پسند تھیں، جو دوڑ میں حصہ لیتی تھیں۔ ہیلن اس کی چہیتی تھی جس کو اکثر اس کی مرضی کے بغیر دوڑ کے لئے لایا جاتا تھا۔ شاہ کہتا تھا: ''ہیلن کے سینے کا ابھار، گردن کا خم، کولہے کی گولائی اور پتلی کمر سنگ مرمر سے تراشی گئی ایک آسمانی پری کا انسانی روپ ہے۔''

ایک روز ہیلن دوڑ کے دوران گر گئی اور خون کی الٹی کرنے لگی۔ اس حادثے سے وہ جانبر نہیں ہو سکی۔

ساتویں صدی: قدیم یہودی مائتھولوجی میں عورت تمام مصائب کی جڑ سمجھی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ حضرت حوا کو بھی بخشا نہیں گیا ہے۔ اسی طرح عرب میں دور جہالت میں لڑکی کی پیدائش نحوست سمجھی جاتی تھی اور نوزائیدہ لڑکی کو زندہ گور کیا جاتا تھا۔

پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی مجلس میں ایک شخص نے کہا کہ میری ایک بیٹی مجھ سے بڑی مانوس تھی۔ میں بلاتا تو میرے پاس فوراً آجاتی تھی۔ ایک روز میں نے بلایا اور وہ میرے پاس آئی۔ میں نے اس کو اپنے ساتھ لیا۔ راستے میں ایک کنواں تھا۔ میں نے دھکا دے کر اس کو گرایا۔ وہ ہائے ابا، ہائے ابا کہہ رہی تھی۔ یہ سن کر حضورؐ روئے۔ مجلس میں ایک صحابہ نہ کہا ''اے شخص تم نے حضور کو غمگین بنا دیا۔'' آنحضرتؐ نے فرمایا۔ اس کو بولنے دو اور دوبارہ سنانے کے لئے کہا۔ حضورؐ بڑے روئے اور داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ حضورؐ نے فرمایا۔ دور جہالت کے گناہ کو اللہ نے معاف فرمایا ہے۔

(ماخوذ تفہیم القرآن)

زمانہ وسطیٰ: زمانہ وسطیٰ میں یوروپ میں ہزاروں عورتوں کو جادوگرنی، ڈائن اور چڑیل کہہ کر موت کی نیند سلایا گیا۔ حوا کی بیٹی پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ بچوں کو کھاتی ہے اور انسان کو نقصان پہنچاتی ہے۔ چودھویں صدی میں خصوصی عدالتیں Inquisition قائم کی گئیں اور ہزاروں عورتوں کو اذیت ناک سزائیں دی گئیں۔ سولہویں صدی میں مورین میں پندرہ سال کی مدت کے دوران نوسو حوا کی بیٹیوں کو ہلاک کیا گیا۔ سترہویں صدی میں انگلینڈ میں یہی خونین تاریخ دہرائی گئی اور ہزاروں حوا کی بیٹیوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ شہرۂ آفاق ڈرامہ نگار اور ادیب ولیم شیکسپیئر کہتا ہے۔ ''عورت تیرا نام کمزوری ہے۔''

انہیں دنوں ویلز میں ایملی ہزاروں نوجوانوں کے دل کی دھڑکن تھی۔ وہ (Rose of Wells) ویلز کا گلاب کہلاتی تھی۔ اس کی نیلی آنکھیں جھیل جیسی گہری تھیں۔ یہ کہا جاتا تھا کہ اس کے شفاف گلے سے پانی حلق میں جاتا ہوا

نظر آتا ہے اور اس کی سنہری زلفیں ہر کسی کو اپنا اسیر بنا سکتی ہیں۔ تاہم وہ رچرڈ کو جی جان سے چاہتی تھی۔ رچرڈ گیت کار اور گلوکار تھا۔ اس کے قلم میں اثر اور آواز میں جادو تھا۔ ایملی بڑی خوش خلق، ہنس مکھ اور ملنسار تھی۔ وہ ہر وقت ہنستی اور مسکراتی نظر آتی۔ پھر ایک لارڈ کے بیٹے نے اس پر ڈورے ڈالے۔ ایملی نے رچرڈ سے اپنے پیار کا حوالہ دیتے ہوئے اس کو ٹھکرا دیا۔ لارڈ کا بیٹا برافروختہ ہوا اور حکام کو رپوٹ دی کہ ایملی جادوگرنی ہے۔ پولیس نے ایملی کو گرفتار کیا اور اقبال جرم کے لئے اذیتیں پہنچائیں۔ آخر کار اس کو زندہ جلا دیا۔

انیسویں صدی: راجپوتانہ کے جنگل میں ایک انگریزی شکاری گھوم رہا تھا۔ اس نے دور ایک بھیڑ دیکھی۔ جو ایک پہاڑی ڈھلان سے نشیب کی گھاٹی کی طرف دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ انگریز نے اپنی آنکھوں سے دوربین لگائی۔ بھیڑ میں ایک ارتھی بھی تھی۔ گھاس کے ایک وسیع تلے پر آ کر بھیڑ رک گئی، جہاں ایک چتا بنائی گئی تھی۔ یہ جگہ ایک شمشان لگتی تھی۔ چند آدمی ایک عورت کو تھامے چتا کے پاس آئے انگریز نے ستی کے بارے میں سنا اور پڑھا تھا۔ اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا وہ بھیڑ کے پاس پہنچا۔ چتا کو آگ لگا دی گئی تھی اور شعلوں کی لپیٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے قریب ایک عورت گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔ انگریز کو لگا کہ عورت گھونگھٹ کی آڑ میں رو رہی ہے۔ اسے خدشہ ہوا کہ جلد ہی وہ چتا پر ہوگی اور جل مرے گی۔ انگریز گھوڑے سے اترا اور عورت کو بچانے کے لئے آگے بڑھا۔ چند آدمیوں نے انگریز کو للکارا۔ اس نے بندوق کی شست ان کی طرف کی اور ہوا میں چند گولیاں چلائیں۔ چند لمحوں میں بھیڑ منتشر ہوئی اور شمشان لوگوں سے خالی ہو گیا۔ صرف اکیلی عورت گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی رہی۔ انگریز نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا۔ عورت جوان تھی اور خوبصورت بھی تھی۔ انگریز نے عورت کو اپنے گھوڑے پر بٹھایا اور اپنے بنگلے میں

لایا۔عورت نے بتایا کہ چار ماہ پہلے اس کی شادی اس کی مرضی کے بغیر ایک ۷۵ سالہ بوڑھے سے کی گئی ، جو آج صبح مر گیا۔ اس کو ستی کے لئے شمشان پر لایا گیا ہے۔ انگریز نے جس کا نام ڈینیل تھا۔ عورت سے شادی کی اور اس کو انگلینڈ لے گیا۔ ان کو سات بیٹے بیٹیاں پیدا ہوئے۔

بیسویں صدی: کمار اور پونم کی شادی ان کی مرضی سے ہوئی تھی۔ دونوں کالج میں ایک ساتھ پڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ جینے اور مرنے کا عہد کیا۔ دونوں کے والدین نے ان کی پسند کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ اپنے پرائے سبھی کہتے تھے کہ دونوں کی جوڑی بڑی خوبصورت ہے۔ لیکن شادی کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ ان کے رشتے میں دراڑ آئی ۔ ہر دم پونم کے مسکراتے اور کھلکھلاتے چہرے پر غم کا سایہ منڈلانے لگا اور پھول جیسا چہرہ مرجھا گیا۔ پونم نے اپنے ماں باپ کو بتایا کہ کمار کے ماں باپ جہیز کے نام پر اس کو رات دن ذہنی اذیتیں پہنچا رہے ہیں اور کمار خاموش تماشائی بنا رہتا ہے۔ اپنی بیٹی کے مغموم چہرے کو دیکھ کر ماں باپ کا دل کڑھتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بیٹی کو اس عذاب سے نکالتے ، یہ المناک خبر آئی کہ آگ میں جھلستی ہوئی پونم کو اسپتال لے جایا گیا ہے، جہاں وہ چل بسی البتہ مرنے سے پہلے اس نے بیان دیا کہ ساس سسر نے اس کے جسم پر مٹی کا تیل چھڑک دیا اور پھر آگ لگا دی۔

اکیسویں صدی: جہیز کے لئے آئے دن زندہ جلانے کی وارداتوں کی مذکورہ وار دات ہندوستان میں ہوئی اور نفس عزت کے نام پر حوا کی بیٹی کی جان لینے Honour Killing کے اکثر واقعات کا یہ واقعہ پاکستان میں ہوا۔ آسیہ ایک پٹھان کی بیٹی تھی اور شہزاد پنجابی تھا۔ دونوں یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے تھے اور ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ لیکن آسیہ کے والدین اس کی شادی کے خلاف تھے۔ وہ اپنی بیٹی

کی شادی اپنے قبیلے کے ایک جوان سے کرنا چاہتے تھے لیکن آسیہ کو یہ رشتہ قبول نہیں تھا۔ باپ نے دھمکی دی کہ اگر اس نے اس کی مرضی کے خلاف شادی کی تو وہ اس کو گولی مار دے گا۔ لیکن محبت دھمکیوں سے نہیں ڈرتی۔ آسیہ اور شہزاد نے چپکے سے شادی کی اور روپوش ہو گئے۔ آسیہ کا والد آگ بگولہ ہوا اور دونوں کی جان لینے کے در پے ہوا۔ خیر خواہوں نے آسیہ کے والد جبار خان اور بیٹے آصف خان کو سمجھایا کہ آسیہ اور شہزاد کی جوڑی آفتاب اور ماہتاب کا ملن ہے۔ خدارا اس ملن کو قائم رکھو لیکن جبار خان پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ کہتا تھا کہ آسیہ نے حکم عدولی ہی نہیں کی ہے بلکہ بغاوت کی ہے اور خاندان کے نام پر بٹہ لگایا ہے۔ وہ رات دن اس ٹوہ میں رہتا تھا کہ جب بھی آسیہ اور شہزاد کا سراغ ملے تو کام تمام کر دے گا۔

ایک روز اس کو پتہ چلا کہ شہزاد اور آسیہ سیاحتی مقام مری میں ہیں۔ وہ مری پہنچا اور دونوں کو ہلاک کر دیا۔ قتل کی اس واردات میں اس کا بھائی آکبر خان بھی شامل تھا۔

اکیسویں صدی سائنس اور ٹیکنالوجی کی صدی ہے۔ روشن خیالی اور ترقی پسندی کی صدی ہے۔ ہر ملک کے آئین نے مرد اور عورت کو برابری کا درجہ دیا ہے لیکن ترازو کے ایک پلڑے میں حوا کی بیٹی اور دوسرے پلڑے میں آدم کے بیٹے کو ڈالا جائے تو ہمیشہ آدم کے بیٹے کا پلڑا بھاری رہتا ہے۔

قدیم روم میں عورت کو ننگ دھڑنگ دوڑایا جاتا تھا۔ آج مصنوعات کی فروخت کے لئے فیشن پریڈ کے نام پر حوا کی بیٹی کے انگ انگ کی نمائش کی جاتی ہے۔

ساتویں صدی میں لڑکی کو زندہ در گور کیا جاتا تھا۔ آج حوا کی بیٹی کو سونو گرافی کے ذریعے ماں کے رحم میں ہی موت کی نیند سلائی جاتی ہے۔

ماضی میں بادشاہوں کے حرم میں سینکڑوں عورتوں کو رکھا جاتا تھا۔ آج ہزاروں عورتوں کو قانون کی رو سے کوٹھوں میں رکھا جاتا ہے۔

کل دیوداسیوں کی حکایت تھی۔ آج داشتاؤں کا قصہ ہے۔ حوا کی بیٹیوں پر کبھی مندر اور کبھی مسجد کا دروازہ بند کیا جاتا ہے۔ حوا کی بیٹیوں کی روداد ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔

اس پانچ سالہ بچی کی دلدوز کہانی کون لکھے گا۔ جس کی عصمت دری کی گئی اور پھر اس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ کمسن حنا کی بپتا کون سنائے گا۔ جس کو اسکول جاتے ہوئے آغوا کیا گیا۔ ایک سال ہو چکا ہے۔ اس کا سراغ نہیں ملا ہے۔ اس کا باپ اسی صدمے سے دل کی حرکت بند ہونے سے فوت ہوا ہے اور حنا کی ماں اس کی یاد میں رو رو کر اندھی ہو گئی ہے۔

کامنی کے چہرے پر کسی نے تیزاب پھینکا ہے۔ اس کی بینائی چلی گئی ہے اور چہرہ مسخ ہوا ہے کامنی اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی ہے۔ اس کے بارے میں کون لکھے گا؟

وہ جوان عورت جو آپ ہی آپ بڑبڑا رہی ہے، مریم ہے۔ ذہنی مریضہ ہے۔ چھ ماہ پہلے اس کے شوہر نے دبئی سے فون پر بلا جواز اس کو طلاق دی ہے اور نان نفقہ کے بغیر وہ دو بچوں کے ساتھ فاقہ کشی کر رہی ہے۔ ہمارے شہر کی میونسپلٹی (بلدیہ) کے ملازمین کو آج پھر دو کوڑے دانوں میں گمنام ماؤں کے لاوارث نوزائیدہ بچے ملے ہیں۔ یہ نوزائیدہ بچے حسب معمول حوا کی بیٹیاں ہیں۔

حوا کی بیٹیوں کی یہ لامتناہی اور غیر مختتم سچی کہانیاں صدیوں سے چلی آ رہی ہیں اور حوا کی بیٹیاں اس دن کی راہ تاک رہی ہیں، جب اس لمبی سیاہ رات کے بعد سحر آئے گی اور ایک نئی کہانی لکھی جائے گی۔

☆☆☆

مدھ بھرے رومانی خطوط

عبدالغنی شیخ

مجھے مدھ بھرا ایک رومانی خط ملا۔ جس میں میری مطبوعہ کہانی 'چوں چوں کا مربہ' کی تعریف کی گئی تھی۔ مکتوب نگار ایک خاتون تھی۔ میں چوکنا ہوا۔ ایسا ہی ایک رومانی خط تین دہے پہلے مجھے آیا تھا۔ جب میری کہانی 'الو کا پٹھا' کی بڑی تعریف کی گئی تھی۔ تب بھی لکھنے والی نام کی مناسبت سے ایک عورت تھی۔ لکھا تھا ''آپ کا ہاتھ چومنا چاہتی ہوں۔ خط کا جواب ضرور دیں''

میں نے اپنی کہانی الو کا پٹھا' دوبارہ پڑھی اور اظہار تشکر میں ایک خط لکھا تھا۔ اس کا جواب آیا۔ پیاری پیاری باتیں لکھی تھیں۔ دوسرے خط میں راز و نیاز کی باتیں تھیں۔ ''میں ایک لمحہ بھی آپ کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتی ہوں۔ میرے خیالوں پر صرف آپ چھائے رہتے ہو۔ آپ کو اپنا دل کیسے دکھاوں؟ رات کو تارے گنتی ہوں یا آپ کی کہانیاں پڑھتی ہوں۔ کبھی گھنٹوں آپ کی یاد میں کھوئی رہتی ہوں ایسے میں نیند آجاتی ہے۔ صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو سب سے پہلے آپ کا نام ذہن میں آجاتا ہے۔ آپ کی تصویر ہمیشہ میرے سینے سے لگی رہتی ہے'' میں نے جواب لکھا۔

''محترمہ، میں شادی شدہ ہوں۔ دو بچوں کا باپ ہوں'' ....

جواب آیا ''تو پھر کیا ہوا۔ کرشن چندر شادی شدہ نہیں تھے؟''

میں نے جواب میں لکھا۔ ''میرا مقابلہ کرشن چندر جیسے عظیم ادیب سے نہیں کرو''

''آپ میرے لئے کرشن چندر ہیں۔ چیخوف ہیں۔ او ہنری ہیں اور موپاساں ہیں'' اس نے جواب میں لکھا تھا۔

پھر اس کے خطوط تسلسل سے آنے لگے۔ فصیح اور بلیغ اردو میں وہ نیلے سنہرے اور گلابی رنگ کے کاغذ پر خط لکھتی۔ کونے پر فورگیٹ می ناٹ' لکھا ہوتا یا ہاتھ سے پھول کی تصویر بنی ہوتی اس کی تحریر صاف ستھرے اور خوش خطی میں ایک دلکشی تھی کوئی دھبہ نہیں۔ خط کے ساتھ گلاب کے پھول کی چند پنکھڑیاں ہوتیں۔ لفافہ کھولتے ہی سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو آتی۔ میں مکتوب نگار کی ادا کا شیدا اور اس کی خوش سلیقگی کا جی جان سے فدا تھا اور جواب دئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

ان دنوں خط و کتابت کو آدھی ملاقات سمجھی جاتی تھی۔ سیل فون تو در کنار لینڈ لائن بھی خال خال ہوتا تھا۔ خطوط نگاری ہی خیر و خیریت پوچھنے اور اظہار خیال کا واحد ذریعہ تھا۔ خطوط اپنے شہر سے لکھے جاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے مکان کے پچھواڑے مکان کا کوئی مکین یہ خطوط لکھ رہا ہے اور انہیں پڑھتا ہوا ایسا گماں ہوتا تھا کہ دو آدمی فون پر بات کر رہے ہیں۔ اپنی وردی میں وردی پوش جوان ڈاکیہ بڑا چاق و چوبند لگتا تھا۔ وہ مجھے سیلوٹ کرتا تھا اور باقاعدگی سے اپنا خط چھوڑ کر چلا جاتا تھا ، میں کبھی کبھی ایک دو روپیہ اس کو انعام میں دیتا تھا۔ تب ایک روپیہ کی بڑی قیمت تھی۔ اب کے مجھے شبہ ہونے لگا کہ کہیں مکتوب نگار اور ڈاکیہ میں ملی بھگت تو نہیں۔

مکتوب نگار کا پتہ مبہم تھا۔ میں نے لکھا، تمہارا پتہ واضح نہیں ہے جس محلے کا نام دیا ہے۔ وہاں سینکڑوں کنبے رہتے ہیں۔ اگر پتہ واضح ہوتا۔ تو مجھے تم سے ملاقات کرنے میں مسرت ہوتی۔

''جو کوئی کوئے یار میں رہتا ہے ، وہ پتہ نہیں دیتا۔ اگر ٹھیک پتہ دوں تو رقیب کو معلوم ہوگا۔'' اس نے جواب میں لکھا تھا

مجھے تو ڈر لگتا ہے۔آپ نے غالب کا وہ شعر نہیں پڑھا،

جب محبوب کی ذرا لاپروائی سے رقیب کو محبوبہ کا پتہ چلا پھر خوشخبری۔۔۔۔۔"

"وہ دن جلد ہی آنے والا ہے جب آپ میرے سامنے بیٹھے ہوں گے۔کھڑکی کھلی رہے گی اور آپ سورج کو غروب ہوتے اور پہاڑی کی اوٹ سے چاند کو طلوع ہوتے ہوئے اکثر دیکھا کرو گے"

"تم مجھے اپنے گھر میں قید رکھنے کا ارادہ رکھتی ہو؟"میں نے لکھا

"چاند اور سورج کا ملن دیکھ کر آپ کا دل خوش ہو جائے گا" یہ اس کا جواب تھا۔ایک روز لکھا تھا۔"آپ کی تحریر میں پی جی ووڑ ہاوس کی ظرافت کی چاشنی ہے۔ ۔سومرٹ مام کا مشاہدہ اور ارنسٹ ہمینگ وے کے تجربے ہیں۔آپ کی ہر کہانی میں وحدت تاثر ہے۔" خدارا مجھے بانس پر نہیں چڑھاو۔میں نے لکھا"بہر حال مجھے یہ ماننا پڑے گا کہ تم نے غیر ملکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے لیکن تم نے اپنے اردو ادیبوں کے بارے میں بہت کم تذکرہ کیا ہے۔

"مجھے کرشن چندر کی رومانیت مجتبی حسین کی ظرافت، سعادت حسن منٹو کی عریاں نگاری، عصمت چغتائی کی دیدہ دلیری،اور راجندر سنگھ بیدی کی حقیقت نگاری بڑی پسند ہے۔آپ کی نئی کہانی "چھچوندر کا جنازہ" ظرافت اور رومانیت کا خوبصورت امتزاج ہے۔

ایک روز لکھا تھا۔"الو کا پٹھا" پڑھ کر کبھی آپ کی تصویر اور کبھی الو کا منہ دیکھتا ہوں"

"کیا میں الو لگتا ہوں؟"مجھے بڑا غصہ آیا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے آپ نے ایک مادہ الو کو الوؤں کی دنیا کی حسینہ عالم کے روپ میں پیش کیا ہے۔تب سے مجھے الو اچھا لگتا ہے ۔آپ اپنا غصہ تھوک

دیجئے'' اسی خط میں لکھا تھا'' جی چاہتا ہے کہ آپ میری آنکھوں کے سامنے بستر پر دراز رہے اور میں آپ کے لئے ناشتہ تیار کروں چھولے پوری اور کھیر کھلاوں''

مجھے چھولے پوری پسند نہیں ہے۔'' میں نے لکھا۔

''پھر کھانے پینے کی کیا کمی ہے۔'' اس نے جھٹ لکھا۔ ''بٹر ٹوسٹ، مربہ، دودھ اور برن دیٹا، پورج، ابلے ہوئے انڈے اور پھلوں کے جوس، آپ کو کون سا جوس پسند ہے؟ سنترہ، پین ایپل یا آم ؟ دستر خوان بچھاؤں؟ یا ڈائینگ ٹیبل پر سجاؤں؟

مجھے نان اور نہاری پسند ہیں۔ اور انار کا جوس پسند کرتا ہوں۔'' ٹھیک ہے آپ کے لئے نان اور نہاری لائیں گے'' پھر سوال کیا تھا۔ ''الو کا پٹھا'' کے بعد آپ نے کون سی کہانی لکھی ہے؟

''چابی کا لٹھا''

''آپ کی کہانیاں ہم قافیہ ہوتی ہیں۔'' آپ نے مرغ کی بانگ'' کے بعد'' گدھے کی ہانک'' لکھی'' گدھے کی دم'' کے بعد کیا آپ نے کوئی مقفی کہانی لکھی ہے؟'' اگر نہیں لکھی ہے تو مجھے ایک عنوان سوجھا ہے'' گھوڑے کا سم'' یہ عنوان پسند آئے تو ایک کہانی اسی عنوان سے لکھیں''

میں نے جواب دیا'' میں ضرور لکھوں گا'' پھر اس نے سوال کیا تھا۔' آپ ہمیشہ جانوروں اور پرندوں پر کہانیاں لکھتے ہیں۔ ہو نہ ہو۔ ان سے ماضی میں آپ کا کوئی نہ کوئی رشتہ رہا ہوگا'! 'کیا آپ کو کوئی دوسرا موضوع نہیں ملتا؟''

''جانور اور پرندے انسان سے بہتر ہوتے ہیں۔ یہ جھوٹ نہیں بولتے۔ دھوکا نہیں دیتے انسان کا دماغ نہیں چاٹتے'' میں نے جواب دیا

۔'' کتے کاٹتے ہیں۔ سانپ ڈستے ہیں اور گدھ اپنی چونچ سے ٹھونگیں مارتے ہیں۔'' اس نے جھٹ جواب دیا۔ مجھے کوئی جواب نہیں سوجھا۔ صرف اتنا لکھا۔ مجھے

جانوروں سے گہرا لگاو ہے،''اور پوچھا'' تمہیں۔اتنے سارے خطوط لکھنے کی فرصت کیسے ملتی ہے؟۔

مجھے آپ کی کہانیوں سے تحریک ملتی ہے اور آپ کو خط لکھنے میں سکون ملتا ہے''

''خط و کتابت اب بہت ہوئی، ہم ملاقات کرتے ہیں۔'' میں نے لکھا یا پہلے فون پر بات کرتے ہیں۔۔اپنی پیاری آواز کی کھنک سے میرے کانوں میں رس گھولیے یا کم سے کم پہلے اپنی تصویر بھیج دو''

جواب میں لکھا'' جو مزا ہجر میں ہے وہ وصل میں کہاں؟ ملاقات کے بعد محبت کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔

ہمارے گھر پر ٹیلی فون نہیں ہے۔اگر فون ہوتا تو آپ سے آٹھوں پہر باتیں کرتی ۔میں اتنی بے حیا نہیں ہوں کہ کسی بیگانے کے گھر سے اپنے محبوب کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کروں۔ پھر میں نے فرمائش کی کہ کم سے کم اپنی تصویر بھیج دو۔ ضواب دیا۔

تصویر دھوکا دیتی ہے۔کوئی بدصورت ہوتا ہے لیکن فوٹو میں اس کی تصویر اچھی نظر آتی ہے۔ میں فوٹو جینک نہیں ہوں تاہم میرے خدوخال جب ایک دن تم دیکھو گے تو مبہوت رہ جاو گے''

میں نے فوراً جواب دیا۔''تم ملاقات نہیں کرنا چاہتی ہو اور نہ فون کرنے کے لئے آمادہ ہو جب تک اپنی تصویر نہیں بھیجو گی، میں تمہارے خط کا جواب نہیں دوں گا۔یہ میرا حتمی فیصلہ ہے''۔میں نے اس کے خطوط کا جواب نہیں دیا

''آپ نہیں مانو گے۔ میں ہاری آپ جیتے۔لو تصویر ارسال کرتی ہوں۔خط کے ساتھ مشمولہ چھوٹے سے لفافے کے اندر ہے''

چھوٹے لفافے کے اندر مونا لیزا کی تصویر تھی ،میں غصے سے آگ بگولہ ہو گیا

اورفوراً لکھا

"تم نے مجھے بے وقوف سمجھا ہے؟ میں اتنا نادان نہیں ہوں کہ مونالیزا کی تصویر کو نہ پہچانوں؟ کیا تم جانتی ہو کہ مونالیزا کی یہ تاریخی تصویر کس نے بنائی؟ جانتی ہو تو بتاو۔ اس تصویر کو لیونارڈ دڈاوانسی نے بنائی تھی۔ یورپ میں وہ نشاۃ ثانیہ کی عبقری شخصیت تھی۔ عبقری کا معنی معلوم ہے؟ عبقری Genius کو کہتے ہیں۔ لیونارڈ دانسی یگانہ روزگار اور جامع کمالات تھے۔ سائنس دان، ریاضی دان، نقشہ ساز، معمار، مصور، سنگ تراش، ماہر طبقات الارض اور ماہر نباتات۔ ایک آدمی کی ذات میں اتنی خوبیاں اور کمالات جمع ہوئے تھے۔ ان کی تحریریں اور خاکے تیرہ ہزار صفحات پر محیط ہیں۔

لیونارڈ وونسی ۱۵ اپریل ۱۴۵۲ء کو اٹلی کے ایک گاوں ٹس کینی میں پیدا ہوئے۔ گھر پر کچھ تعلیم حاصل کرنے کے بعد چودہ سال کی عمر میں اس کو اپنے زمانے کے ایک سرکردہ سنگ تراش ویریک چیو کے پاس علم و ہنر سیکھنے کے لئے رکھا۔ جہاں اس نے مصوری اور سنگ تراشی سمیت کئی ہنر سیکھے۔ لیونارڈ وونسی کو جاننے اور سیکھنے کا غیر معمولی تجسس تھا۔ ایجاد اور اختراع کے لئے اس کے تخیل کی اڑان جست بھرتی تھی۔ اسی جامع کمالات انسان نے مونالیزا کی تصویر بنائی۔ جس کا شہرہ ساری دنیا میں ہے۔ اس تصویر کی شہرت کا راز مونالیزا کی پراسرار مسکان ہے۔، جو اس کے لبوں اور چہرے پر کھلتی ہے۔ یہ مسکان دیکھنے والوں کے لئے ایک معمہ ہے۔ ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔ ساری دنیا اس کا جواب چاہتی ہے۔

لیونارڈ دوانسی ۲۱ مئی ۱۵۱۹ء کو اپنے وطن سے دور فرانس کی وادی لویئرے کے ایک مقام کلوز لوسے میں فوت ہوئے۔ میں ان معلومات کے ساتھ مونالیزا کی تصویر تمہیں واپس کر رہا ہوں۔ یاد رکھو، آئیندہ مجھے اور کسی اور کو بے وقوف بنانے کی

کوشش نہیں کرنا۔''

ایک ہفتہ بعد مجھے اس کا لفافہ ملا میں نے بے تابی سے اسے کھولا۔اس میں مدھو بالا کی تصویر تھی۔اس کے بعد ہمارے درمیان خط وکتابت ختم ہوگئی۔

اب تین دہائیوں کے بعد ایک رومانی خط موصول ہوا ہے۔جس میں نسوانی نام کی مکتوب نگار نے میری کہانی 'چوں چوں کا مربہ' کی تعریف کرتے ہوئے لکھا۔ہے'' آپ کا قلم چومنے کو جی چاہتا ہے اور آپ کے رخسار اور ہونٹوں کا بوسہ لینے کو من مچلتا ہے۔''

پرانی یاد تازہ ہوگئی اور پرانا تجربہ اڑے آیا۔اس لئے خط کا جواب نہیں دیا ایک ہفتہ بعد اس کرم فرما کا ایک اور خط ملا جہاں میری کہانیوں کو سراہا تھا۔،وہاں راز و نیاز کی باتیں بھی کی تھیں۔''آپ کا افسانوی مجموعہ ''مینڈک کی واپسی'' پڑھ کر بڑا مزا آیا۔ چند کہانیوں کو دو دو مرتبہ'' پڑھا۔اور مس چمگادڑ کی لاش، پڑھ کر ہونٹوں پر مسکان آئی اور آنکھوں میں آنسو آئے۔آپ نے چمگاڈروں کی دنیا کی حسینہ کو جلدی مردا دیا ۔ایک دو سال زندہ رکھتے تو کیا فرق پڑتا۔وہ تو ہزاروں نوجوان چمگادڑوں کے دل کی دھڑکن تھی۔آپ بڑے سنگ دل ہیں۔کسی کے دل کے آبگینے کو اس طرح توڑا نہ کیجئے۔۔۔'' ''غٹرغوں غٹرغوں''، اور ''کوا چلا ہنس کی چال'' بڑی پسند آئیں۔ دونوں کہانیاں تین تین مرتبہ پڑھیں۔آپ کیا خوب لکھتے ہیں۔آپ کے قلم میں کیا جادو ہے؟ آپ کی کہانیوں نے مجھے آپ کا اتنا گرویدہ بنالیا ہے کہ میں آپ کو پوجنے لگی ہوں۔آپ میری نس نس میں بسے ہو۔ہر لمحہ آپ کی یاد ستاتی ہے۔آپ میرے دل و دماغ پر چھائے ہو۔کسی نے آپ سے پہلے مجھے پیار کا ایسا جذبہ نہیں دیا۔یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔آپ کی یاد میں، میں مسکراتی ہوں۔ہنستی ہوں اور روتی ہوں۔کسی نے مجھے مسکرانا ہنسنا اور رونا نہیں

سکھایا۔آپ جب اپنے بستر پر روشنی بجھاتے ہیں تو یہ سوچنا کہ میں آپ کو یاد کر رہی ہوتی ہوں۔''

میں نے خط کا جواب نہیں دیا البتہ میرے تحت الشعور میں ایک انجانی اور غیر مرئی خواہش اکسانے لگی کہ میں اپنی کہانیوں غٹرغوں غٹرغوں اور کوا چلا ہنس کی چال، پڑھوں۔ چنانچہ دونوں کہانیاں پڑھ لیں پھر یکے بعد دیگرے اس کرم فرما کے تین خط ملے۔کہانیوں پر توصیفی تبصرے کے ساتھ پیار کا اظہار کیا تھا، تیسرے خط میں پوچھا تھا کہ غٹرغوں غٹرغوں کس پنچھی پکھیرو کی آواز ہے۔کوا ہے یا کبوتر؟

جی چاہا کہ اس کو لکھوں کہ آپ نے کہانی پڑھی ہی نہیں ہے۔اگر پڑھی بھی ہے تو اوپر اوپر سے پڑھی ہے اور سمجھے بغیر مجھے تعریف کی ہے۔آپ دوبارہ کہانی پڑھیں پھر خیال آیا کہ اس نے مجھ سے جواب اخذ کرنے کے لئے یہ نکتہ ابھارا ہے۔ چنانچہ جواب لکھا

''محترمہ، کوا کائیں کائیں کرتا ہے غٹرغوں غٹرغوں تو کبوتر کرتا ہے۔ کہانی سے واضح ہے آپ دوبارہ کہانی پڑھنے کی زحمت کریں.اب رہا آپ کے اظہار محبت کا۔ میں ستر سال کے پیٹے میں ہوں۔ میرے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیاں ہوئیں ہیں اور ان کی اولاد ہوئی ہیں۔اولاد کی بھی اولاد ہونے والی ہے۔

جواب میں لکھا تھا۔''ستر سال کے پیٹے میں ہو تو کیا ہوا؟ برنارڈ شاہ، کو اسی کے پیٹے میں بھی حسینائیں اظہار محبت کرتی تھیں بوڑھا آیئن سٹائین جب باہر نکلتے تو عورتیں اس کا پیچھا کرتی تھیں اور اصرار کرتی تھیں کہ ان کو اپنے عقد میں لیں۔۔۔۔ ہر عورت کو زندگی میں ایک رہبر کی ضرورت ہوتی ہے اور میں نے آپ کو اپنا رہبر بنایا ہے

''میں نے لکھا'' آپ مجھے عالمی شہرت کی ہستیوں کی مثالیں دے کر ان کے

زمرے میں شامل نہ کرے۔ مجھے تو اپنے شہر میں بھی بہت کم لوگ جانتے ہیں''۔

آخر میں، میں نے لکھا'' آج موبائیل فون کا زمانہ ہے۔ کبھی ہم فون پر باتیں کرتے ہیں۔ آپ کو لمبی لمبی چھٹیاں لکھنے کی عادت کیسے پڑی ہے؟

جواب میں لکھا تھا، شریف لوگ فون پر بات نہیں کرتے۔ آپ نے طالبان کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ انہوں نے افغانستان میں اپنی حکومت کے دوران ریڈیو اسٹیشن میں کسی عورت کو اناونسر نہیں رکھا تھا کیونکہ نسوانی آواز جنسی خواہش کو ہوا دیتی ہے۔''

وہ ایسا نکتہ ابھار رہی تھی کہ جواب دئے بغیر نہیں رہا گیا، لکھا۔'' طالبان کی مثال دے کر دور کی کوڑی لائی ہو۔ اگر یہ بات مان لی بھی جائے تو کیا یہ مناسب ہے کہ ایک شریف عورت یا لڑکی ایک نامحرم مرد کو خط لکھے۔ اسے پہلے میں تمہارے خط کا جواب دوں۔ تمہیں اپنی سچائی ثابت کرنی ہوگی''

اس کے بعد بھی وہ باز نہیں آئی اور کئی خطوط لکھے۔ میں نے جواب نہیں دیا۔

پھر قدرے لمبی مدت کے بعد اس کا خط آیا لکھا تھا۔

''آپ بڑے ضدی ہیں۔ بڑے ہٹ دھرم ہیں۔ مغرور ہیں۔ اکڑ کرنا کوئی آپ سے سیکھے، لیجئے فوٹو پیش خدمت ہے۔ لفافہ کے اندر ایک بند لفافہ تھا اسے کھولا تو اس میں سے اس بوڑھی بھکارن کی تصویر نکلی جو ہمارے شہر کے تراہے پر اپنے سامنے کشکول رکھے یا رومال بچھائے رہتی ہے جس کی ناک سے سدا رینٹ ٹپکتی ہے اور منہ سے رال بہتی ہے

☆☆☆

سیاچن گلیشیر

گل گلاب کا گلستان یا بلند ترین محاذ جنگ

عبدالغنی شیخ

اپریل ۱۹۸۲ء میں ہندوستان نے سیاچن گلیشیر کے پاس کوہ سلتورد کے دو درے ۱۸۳۰۰ فٹ بلند سیالا اور ۱۸۲۰۰ فٹ بلافون لا پر ہیلی کاپٹروں سے فوج اتاری۔ پاکستان نے ان کے متوازی ۱۷۰۰۰ سے ۱۸۰۰۰ فٹ بلند دو چوٹیوں پر اپنی فوج اتاری۔ پہلی مرتبہ سیاچن گلیشیر عالمی سطح پر نمایاں طور پر منظر عام پر آیا۔ سیالا تقریباً دو کلومیٹر لمبا ہے۔ لالداخی اور بلتی میں درے کو کہتے ہیں۔ ہندوستان نے سیالا کے مشرقی کنارے پر مورچے بنائے جبکہ پاکستان نے اس کے مغربی کنارے پر چوکیاں بنائیں۔ یہ فریقین کی فوجوں میں معرکہ آرائی کا پیش خیمہ تھا۔ جہاں لڑائی سے جانی نقصانات ہوئے وہاں بلندی، کڑاکے کی سردی اور برف وباد نے بڑی جانیں لیں۔ اور بہت سے تادم حیات معذور اور بیمار رہے۔ ۲۱/سال بعد ۲۰۰۵ء میں جنگ بندی ہوئی۔ توپیں خاموش ہیں لیکن بلندی اور خراب موسم بدستور جانیں لے رہے ہیں۔

سیاچن کی پہچان دنیا کے بلند ترین محاذ جنگ کے طور پر ہوتی ہے۔ عسکری تاریخ میں ایسی جنگ کی کوئی مثال نہیں ملتی جب دو ملکوں نے قطبین کے بعد دنیا کے ایک انتہائی وشوار گزار اور مشکل خطے کو آپسی جنگ کے لئے انتخاب کیا ہو۔ جس کو Third Pole یا تیسرا قطب کہا جاتا ہے۔

تاریخ صرف ایک مشہور جرنیل ہنی بل کا نام لیتی ہے جس نے ۲۲۱ سال قبل مسیح ۹۰

ہزار پیدل، ۱۲ ہزار گھوڑ سوار اور ۳۷ ہاتھیوں کے ساتھ روم پر حملہ کرنے کے لئے برف وباد میں کوہ الپس عبور کیا۔ اِس کے تقریباً آدھے فوجی اور لگ بھگ سارے ہاتھی مر گئے۔ لیکن سیاچن پر چھوٹے پیمانے پر سہی ، برسوں سے یہ تاریخ دہرائی جارہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نپولین روس میں جرنیل سردی سے ہار گیا تھا۔ یہاں جرنیل سردی اور جرنیل گلیشیر دونوں برسرِ پیکار ہیں۔

دونوں ملکوں نے سرکاری طور پر سیاچن پر ہوئے جانی نقصانات کے اعداد وشمار اجرا نہیں کئے ہیں ۔ٹائمز آف انڈیا کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۴ سے ۱۹۹۷ء کے درمیان سیاچن پر اندازاً ۲۰۰۰ ہندوستانی فوجیوں کی جانیں چلی گئیں۔ جن میں زیادہ تر موسم اور بلندی سے مر گئے۔ ۲۰۰۶ تک زخمی اور بیمار ہونے والوں کی تعداد صرف ہندوستان کی بارہ ہزار بتائی جاتی ہے جن میں بہت سارے نفسیاتی مرض کے شکار تھے جبکہ حکومت نے لوک سبھا کو بتایا کہ سیاچن پر اب تک نوسو فوجی کام آئے ہیں۔اخبار کے مطابق ۱۹۹۹ تک پاکستان کے ۱۳۰۰ فوجی کام آئے۔ مالی اخراجات غیر معمولی طور بھاری ہیں۔ صرف ہندوستان روزانہ لگ بھگ ساڑھے چھ کروڑ روپے صرف کررہا ہے۔حکومت نے لوک سبھا کو بتایا کہ ۱۵۔۲۰۱۴ء کے ایک سال کے دوران ۲۳۶۶ اعشاریہ ۶ کروڑ روپیہ خرچ آیا۔محاذ جنگ بننے سے پہلے۔ سیاچن عمومی طور گمنام تھا۔حتیٰ کہ پچھلی صدی کے شروع میں اس کا ہمسایہ علاقہ نوبراہ کے بہت کم لوگ اس سے واقف تھے۔سیاچن گلیشیر کی ایک اولین محقق خاتون فینی بولاک ورک مین رقم طراز ہے:

''میں نے لوگوں سے سنا کہ لوگوں کو سیاچن گلیشیر سے متعلق بہت کم علم ہے۔''

فینی نے ۱۹۱۱ اور ۱۹۱۲ء میں سیاچن کا سروے کیا تھا۔ان کوہ پیمائی کی مہمات میں اس کا شوہر ڈاکٹر ولیم ہنٹر ورک مین اس کے ساتھ تھا۔

سیاچن محاذ شمال میں کانوے سیڈل سے لے کر جنوب میں چولونگ لا تک پھیلا

ہوا ہے۔ درمیان میں گلیشیر حائل ہیں۔ اس لئے تقریباً ہر چوکی پر الگ لڑائیاں ہوئی ہیں۔ محاذ جنگ پیچ و بل کھاتا ہوا ۱۱۰ کلومیٹر کی لمبائی تک پھیلا ہوا ہے۔ سیاچن کے علاوہ سالتورو پر بھی فوجی چوکیاں ہیں۔ جہاں دست بدست لڑائی ہوئی تھی۔ ہندوستان کی اگلی چوکیاں اونچائی پر ہیں۔ لیکن سپلائی لائن پاکستان سے لمبا ہے اس لئے زیادہ فوج مطلوب ہے۔ فریقین کی چوکیاں ایک سے تین کلومیٹر دور ہیں۔ بہت سی چوکیاں ۱۸۰۰۰ فٹ سے اونچی ہیں۔

کانوے سیڈل (Convay Saddle) ایک انگریز کوہ پیما لارڈ مارٹن کانوے کے نام پر پڑا ہے۔ وہ بلتورو گلیشیر کے آخری سرے پر واقع گھوڑے کے زین نما اس پہاڑی سے گزرا تھا اور ۲۳۳۹۰ فٹ بلند بلتورو کنگری کو سر کرنے کی کوشش کی تھی۔ بلتورو کنگری کو گولڈن تھورون (Golden Throne) بھی کہتے ہیں۔

ہندوستان کے ایک اعلیٰ فوجی افسر لیفٹیننٹ جرنیل منوہر لال چھبر نے سیاچن گلیشیر سے متعلق کہا ہے: ''انٹارکٹیکا (Antarctica) سیاچن گلیشیر کے مقابلے میں ایک تفریحی مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔''

پاکستانی جرنیل کے ایم عارف نے سیاچن گلیشیر کے ضمن میں لکھا ہے۔ ''یہ وہ علاقہ ہے جہاں فاصلوں کو کلومیٹروں اور گزوں کے بجائے دنوں اور گھنٹوں میں ناپا جاتا ہے۔ سردی سے جانیں تلف یا مفلوج ہو جاتی ہیں۔ چلتے وقت ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا پڑتا ہے۔ یہاں زندگی اور موت کا درمیانی فاصلہ بہت کم ہے۔''

سیاچن گلیشیر ۷۶ اعشاریہ ۴ کلومیٹر لمبا اور ۶ سے ۷ کلومیٹر چوڑا ہے۔ سیاچن کی وجہ تسمیہ کے پیچھے ایک جنگلی گلاب سیا ہے۔ یہ خودرو پھول خاص کر سیاچن گلیشیر کے جنوب مشرق میں بکثرت اگتا ہے۔ سیا لداخی اور بلتی زبانوں میں گلاب یا جنگلی گلاب کو کہتے ہیں۔ چن کا مطلب اگنے والی جگہ ہے۔ سیا عام طور پر ۸۰۰۰ سے ۱۵۰۰۰ فٹ کی بلندی پر پہاڑ کے پہلو میں اگتا ہے۔ یہ گلابی، پیلے اور سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔

سیاچن پر زیادہ تر گلابی رنگ کے سیا پائے جاتے ہیں۔ نوبراہ وادی سے Base Camp (انتظامی کیمپ) پر پہنچنے سے پہلے سڑک کے کنارے سیا نظر آتے ہیں۔ عام طور پر اس سخت جان پھول کے علاوہ یہاں اور کوئی روئیدگی نظر نہیں آتی تاہم The Exploration of the Siachan or Rose Glacier کی مصنفہ فینی بولاک ورک مین لکھتی ہے: ''سیاچن کے نشیبی اطراف میں اگر کوئی بلانشو ونما پائے Eddwesis (کوہستان الپ کا ایک پودا، جس پر سفید پھول پیدا ہوتے ہیں) اور الپائن کی دوسری چھوٹی نباتات پائیں تو وہ خوش نصیب ہے جبکہ بالائی ۳۰ میلوں کے راستے پر صرف برفانی گلاب (سیا) پروان چڑھتا ہے۔''

سیاچن گلیشیر پاکستان۔ چین سرحد پر واقع درہ ۱۹۵۲۰ فٹ بلند ''ترکستان لا'' سے شروع ہوتا ہے جہاں سے گلیشیر جنوب مشرق کی طرف زینگ رولما نامی مقام تک پھیلا ہوا ہے۔ زینگ رولما دریائے سیاچن کا منبع ہے جو وادی نوبراہ میں لقچونگ نام کے گاؤں کے موڑ پر دریائے شیوق میں جاملتا ہے۔ سیاچن دریا کو دریائے نوبراہ بھی کہتے ہیں۔ سیاچن گلیشیر سلسلہ ہائے قراقرم کے مشرقی حصے میں واقع ہے۔ کوہ قراقرم ۲۰۰ میل لمبا ہے۔ اس سلسلہ ہائے کوہ میں ۳۰۰ چوٹیاں ہیں جن میں ۲۸۲۶۵ فٹ بلند دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی 'کے ٹو' شامل ہے۔ بلتستان کے لوگ کے ٹو کو چھوغوری یا عظیم پہاڑ کہتے ہیں۔ قطبین کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ بڑے گلیشیر قراقرم سلسلہ ہائے کوہ میں ہیں۔ آج سے سوا سو سال پہلے صرف چند چوٹیوں کے بارے میں لوگوں کو علم تھا۔ لداخ میں نوبراہ وادی کا واشی نامی گاؤں سیاچن گلیشیئر سے پہلے آخری گاؤں ہے۔ یہ سیاچن سے لگ بھگ ۴۰ کلومیٹر دور ہے۔ اس گاؤں میں چند ہی گھرانے ہیں۔ اس سے پہلے بریما گونبو گاؤں آتا ہے۔ اس گاؤں میں ۲۵ کنبے بستے ہیں۔ یہاں لداخی بودھ تیرتھ یاترا پر آتے ہیں۔ گونبو اور واشی کے درمیان ۸ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ گونبو کے پیچھے ۷ کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے سیاچن کے آر پار ٹونکسکیت

اور نیونگسکیت گاؤں ہیں۔ جن دنوں سیاچن پر لڑائیاں ہوتی تھیں ان گاؤں کے لوگ توپوں کی گرج سنتے تھے اور رات کو گلیشیر پر آگ کی لپٹیں دیکھ سکتے تھے۔

لیہ سے سیاچن ۲۸۸ کلومیٹر دور ہے بلتستان کے بڑے شہر سکردو سے ۲۲۴ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ سیاچن گلیشیر سے ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر بلتستان میں کندوس اور سالتورو کی سرسبز وادیاں ہیں جہاں متعدد چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ سیاچن گلیشیر سے پہلے وادی سلتورو کا آخری گاؤں گونما اور وادی کندوس کا آخری گاؤں کرمانی ہے۔ ان سے آگے گلیشیر شروع ہوتا ہے۔

سیاچن گلیشیر چھوٹے بڑے متعدد گلیشیروں سے گھرا ہوا ہے۔ شمال کی طرف پہلا گلیشیر کندوس ہے جو تقریباً ۳۰ کلومیٹر لمبا اور ڈھائی کلومیٹر چوڑا ہے۔ دوسرا گلیشیر بالتورو ہے جو قریباً ۴۰ کلومیٹر لمبا اور ایک سے دو کلومیٹر چوڑا ہے۔ ایک اور گلیشیر بلافون ہے جو تقریباً ۲۰ کلومیٹر لمبا اور دو سے تین کلومیٹر چوڑا ہے۔ بلافون بلتی زبان میں تتلی کو کہتے ہیں۔ درہ بلافون کے دونوں پہلو تتلی کے پر کے مشابہ ہیں اور بلافون گلیشیر تتلی کا دھڑ جیسا لگتا ہے۔ اس ضمن میں فینی بولاک مین لکھتی ہے کہ بلافون کا نام سالتورو کے چند گنے چنے لوگوں کی شاعرانہ تخیل آرائی ہو سکتی ہے۔ ایسا تخیل فی زمانہ ان لوگوں میں پایا نہیں جاتا ہے۔

بالتورو گلیشیر کے قرب و جوار میں ایسی ۱۹ چوٹیاں ہیں جن کی بلندی سطح سمندر سے ۲۵ ہزار فٹ بلند ہیں۔ ۱۵ میل کے دائرے میں ۲۶ ہزار فٹ سے بلند ۶ چوٹیاں ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے سیاچن اور دوسرے گلیشیروں کے محاذ پر اکثر چوکیاں ۱۸۰۰۰ فٹ بلند ہیں۔ بعض چوکیاں اکیس ہزار فٹ کی بلندیوں پر قائم کی گئی ہیں۔

موسم گرما میں بھی سیاچن پر درجہ حرارت نقطہ انجماد سے ۱۰ سے ۱۵ ڈگری سنٹی گریڈ نیچے رہتا ہے۔ اس لئے یہ سارا سال برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ سردیوں میں منفی ۳۰ درجے سے ۷۵ درجے تک گرتا ہے اور ساڑھے پندرہ فٹ گہری برف پڑتی ہے۔

آکسیجن کی بڑی کمی ہے اس لئے یہاں انسان گونا گوں بیماریوں کا شکار رہتا ہے۔ سانس کی تکلیف Hypoxia اور پھیپھڑوں میں پانی بھرنے کا مرض High Altitude Pulmonary odema کا شکار ہوتا ہے۔ Frostbite یا برف سے ہاتھ، پیر اور بدن پر ورم پڑنے اور پھوڑہ نکلنے، تھکن، بے چینی اور ہاتھ پاؤں پھٹنے کی شکایت عام ہوتی ہے۔ مرنے کے بعد لاش کچھ دیر پڑی رہے تو اکڑ جاتی ہے۔ ایک سنگین خطرہ اس کی کھائیاں ہیں۔ ان کا شگاف چند انچوں سے لے کر کئی فٹ بڑا ہے۔ کچھ شگاف بہت بڑا ہوتا ہے۔ کوہ پیمان ان سے بچنے کے لئے بہت لمبا چکر کاٹتے تھے۔ کئی دفعہ شگاف کی ہلکی تہہ ہوتی ہے جسے دھوکا لگتا ہے۔ کھائیاں ایک دو فٹ سے لے کر سینکڑوں فٹ گہری ہے۔ اگر گہری کھائی میں گر جائے تو لاش کا ملنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ میں نے ایک حادثہ کے بارے میں پڑھا کہ ایک جوان افسر شگاف میں گر گیا۔ اس کے بدن سے رسی نہیں بندھی تھی۔ وہ دو روز مسلسل بولتا رہا کہ اس کو باہر نکالے۔ ایک جوان کو رسی سے باندھ کر نیچے بھیجا لیکن افسر نظر نہیں آیا۔ اس طرح کوشش کے باوجود ایک ہندوستانی جوان افسر کی جان چلی گئی۔ گلیشیر پر ایک کلومیٹر کا راستہ تعین کرنے میں دو سے تین دن لگتے ہیں۔ برفانی ہوائیں فی گھنٹہ ۱۰۰ سے ۱۵۰ میل کی رفتار سے چلتی ہیں اور اپنی زد میں آنے والے آدمیوں اور چیزوں کو دور پھینک دیتی ہیں۔

سیاچن گلیشیر کی تاریخ اور ماضی کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ کبھی اس کے راستے بلتستان اور چینی سرکستان کے درمیان لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ یہ آمد و رفت کندوس گلیشیر کوہ سلتورو کے شمالی درے سیالا اور سیاچن گلیشیر کے شمالی مغربی کنارے پر واقع 'ترکستان لا' کے راستے سترہویں صدی تک جاری رہی۔ کرنل محمد ذاکر جو بلتستان سے تعلق رکھتا ہے، 'اپنی کتاب سیاچن گلیشیر: دنیا کا بلند ترین محاذ جنگ' میں لکھتا ہے: "تقریباً ۸۰۰ء سے پہلے تک بلافون اور سیاچن میں اس قدر بڑے گلیشیر نہ تھے۔ اس

زمانے میں ان گلیشیروں پر آمد و رفت کے لئے پیدل چلنے والوں، گھوڑوں اور یاک وغیرہ کے لئے راستے موجود تھے۔ بلافون گلیشیر پر علی برانگسا (آرام کرنے کی جگہ) اور سیاچن پر ساسیر برانگسا اور تیرم شہر جیسی جگہوں کا وجود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ماضی بعید میں یہاں پر انسانی آبادیاں موجود تھیں اور سیاچن گلیشیر سے تیرم شہر اور تیرم شہر سے تاریخی درہ قراقرم تک بھی راستے کی موجودگی کے شواہد موجود ہیں...... بلتستان کی طرف سے قدیم زمانے میں سیاچن میں انسانی آبادیاں موجود تھیں۔''

ماضی میں بلتی بیلافونڈ درہ سے اس نخلستانی بستی میں تجارت اور پولو کھیلنے آتے تھے۔

مصنف کے مطابق علی برانگسا نامی جگہ وادی سلتورو کے مشہور شکاری علی سے منسوب ہے۔ مذکورہ بیان میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ سیاچن گلیشیر کے پڑوس صحرائے گوبی میں لگ بھگ ایک ہزار سال پہلے تک بڑی بڑی بستیاں تھیں۔ ان کی تعداد ڈھائی سو سے تین سو تک بتائی جاتی ہے۔ ان بستیوں کے لوگ اسلام اور بدھ مت کے پیروکار تھے۔ جغرافیائی محرکات جیسے آب و ہوا میں تبدیلی، دریاؤں کا رخ بدلنے، پانی گھٹنے اور چشمے سوکھنے سے نخلستان ریگستان میں جذب ہوئے۔ پھر ریت کے بگولے اٹھے اور بستیاں زیر زمین دب گئیں۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے شروع میں یورپیوں نے ان مقامات کی کھدائی کی اور زیر زمین نکالے ہوئے نوادرات یورپ منتقل کئے جہاں انہیں عجائب گھروں وغیرہ میں رکھے گئے۔ ہمارا ایک رشتہ دار صابر ملک ایک یورپی کے ہمراہ ایسی ایک مہم میں گوبی ریگستان گیا تھا۔ میری کم سنی میں جب وہ حیات تھا تو مہم کی چشم دید روئداد سناتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ٹنوں ریت کے نیچے قطار میں موجود انسانی جسم کے پنجر سے ایسا لگتا تھا کہ ریت کے طوفان نے ان کو اچانک اپنی لپیٹ میں لیا۔ ان پنجروں کے سامنے مذہبی موسیقی کے آلات تھے۔ یہ غالباً ایک بودھ مٹھ تھا۔ زیر زمین سونا بھی برآمد ہوا تھا۔ صابر ملک کو مہم کے سربراہ نے ایک جیبی گھڑی تحفہ میں دیا تھا

جس پر اس کا نام نقش تھا۔اب اس گھڑی کا خول بچا ہے۔صابر ملک کی بیٹی نے مجھے دی تھی۔اس پر یورپی کا نام لکھا ہوا ہے۔

بلتستان میں روایت ہے کہ میر سید علی ہمدانی کے بلتستان میں قیام کے بعد آپ چودھویں صدی کے آخری ربع میں سلتورو سے کندوس گلیشیر، سیالا، سیاچن گلیشیر اور بلتستان لا سے ہوتے ہوئے یارقند (چینی ترکستان) تشریف لے گئے۔میر سید علی ہمدانی نے پہلے پہل بلتستان کے لوگوں کو اسلام سے روشناس کیا اور بہت سارے لوگوں نے ان کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔بعد میں دو برادر مبلغین سید علی طوسی اور سید ناصر طوسی سمیت دوسرے مبلغین اسی راستے سے بلتستان آئے۔

فینی بولوک ورک حسین لکھتی ہے کہ میلوں تک پھیلے گلیشیروں کے درمیان تیرم شہر واقع ہے۔تیرم ترکی لفظ ہے جس کا لفظی معنی قابل کاشت زمین ہے۔یہ نخلستان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔تیرم شہر کا گلیشیر ۱۷ میل لمبا اور ڈیڑھ سے دو میل چوڑا ہے۔فینی نے بلتیوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس قدیم شہر میں یارقندی (ترکی) آباد تھے اور یہاں وہ بلتیوں کے ساتھ پولو کھیلتے تھے۔اس کے پڑوس میں گیہاری نام کا بلتیوں کا گاؤں تھا۔یارقندی یہاں مویشی لوٹنے آتے تھے۔تب گیہاری میں گنجان آبادی تھی۔ایک مرتبہ یارقندیوں نے گاؤں میں کام کر رہی ایک بلتی عورت کو اغوا کیا۔ پہاڑ سے آئے ایک برفانی طوفان سے یہ شہر تباہ ہو گیا۔

گیاری یا گیہاری وہی مقام ہے جہاں ۷/اپریل ۲۰۱۲ کو ۱۲۰ سے زائد پاکستانی فوجی برفانی تودوں کے نیچے دب گئے تھے۔یہ سانحہ صبح پانچ بج کر پینتالیس منٹ پر پیش آیا تھا۔ یہاں پہاڑ کے دامن میں بٹالین ہیڈ کوارٹر تھا اور بڑے بھاری ہتھیار رکھے تھے۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پانچ میل کے رقبے میں گلیشیر ٹوٹ کر نیچے آیا تھا اور فوجی اس کی زد میں آئے تھے۔

گیاری ۱۳۰۳۹ فٹ بلند ہے۔اس کی پشت پر بیلافونڈ گلیشیر ہے۔

زمانے میں ان گلیشیروں پر آمد ورفت کے لئے پیدل چلنے والوں، گھوڑوں اور یاک وغیرہ کے لئے راستے موجود تھے۔ بلافون گلیشیر پر علی برانگسا (آرام کرنے کی جگہ) اور سیاچن پر ساسیر برانگسا اور تیرم شہر جیسی جگہوں کا وجود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ماضی بعید میں یہاں پر انسانی آبادیاں موجود تھیں اور سیاچن گلیشیر سے تیرم شہر اور تیرم شہر سے تاریخی درہ قراقرم تک بھی راستے کی موجودگی کے شواہد موجود ہیں......بلتستان کی طرف سے قدیم زمانے میں سیاچن میں انسانی آبادیاں موجود تھیں۔''

ماضی میں بلتی بیلافونڈ درہ سے اس نخلستانی بستی میں تجارت اور پولو کھیلنے آتے تھے۔

مصنف کے مطابق علی برانگسا نامی جگہ وادی سلتورو کے مشہور شکاری علی سے منسوب ہے۔ مذکورہ بیان میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ سیاچن گلیشیر کے پڑوس صحرائے گوبی میں لگ بھگ ایک ہزار سال پہلے تک بڑی بڑی بستیاں تھیں۔ ان کی تعداد ڈھائی سو سے تین سو تک بتائی جاتی ہے۔ ان بستیوں کے لوگ اسلام اور بدھ مت کے پیروکار تھے۔ جغرافیائی محرکات جیسے آب و ہوا میں تبدیلی، دریاؤں کا رخ بدلنے، پانی گھٹنے اور چشمے سوکھنے سے نخلستان ریگستان میں جذب ہوئے۔ پھر ریت کے بگولے اٹھے اور بستیاں زیر زمین دب گئیں۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے شروع میں یورپیوں نے ان مقامات کی کھدائی کی اور زیر زمین نکالے ہوئے نوادرات یورپ منتقل کئے جہاں انہیں عجائب گھروں وغیرہ میں رکھے گئے۔ ہمارا ایک رشتہ دار صابر ملک ایک یورپی کے ہمراہ ایسی ایک مہم میں گوبی ریگستان گیا تھا۔ میری کم سنی میں جب وہ حیات تھا تو مہم کی چشم دید روئداد سناتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ٹنوں ریت کے نیچے قطار میں موجود انسانی جسم کے پنجر سے ایسا لگتا تھا کہ ریت کے طوفان نے ان کو اچانک اپنی لپیٹ میں لیا۔ ان پنجروں کے سامنے مذہبی موسیقی کے آلات تھے۔ یہ غالباً ایک بودھ مٹھ تھا۔ زیر زمین سونا بھی برآمد ہوا تھا۔ صابر ملک کو مہم کے سربراہ نے ایک جیبی گھڑی تحفہ میں دیا تھا

جس پر اس کا نام نقش تھا۔اب اس گھڑی کا خول بچا ہے۔صابر ملک کی بیٹی نے مجھے دی تھی۔اس پر یورپی کا نام لکھا ہوا ہے۔

بلتستان میں روایت ہے کہ میر سید علی ہمدانی کے بلتستان میں قیام کے بعد آپ چودھویں صدی کے آخری ربع میں سلتورو سے کندوس گلیشیر، سیالا، سیاچن گلیشیر اور بلتستان لا سے ہوتے ہوئے یارقند (چینی ترکستان) تشریف لے گئے۔ میر سید علی ہمدانی نے پہلے پہل بلتستان کے لوگوں کو اسلام سے روشناس کیا اور بہت سارے لوگوں نے ان کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔بعد میں دو برادر مبلغین سید علی طوسی اور سید ناصر طوسی سمیت دوسرے مبلغین اسی راستے سے بلتستان آئے۔

فینی بولوک ورک حسین لکھتی ہے کہ میلوں تک پھیلے گلیشیروں کے درمیان تیرم شہر واقع ہے۔تیرم ترکی لفظ ہے جس کا لفظی معنی قابل کاشت زمین ہے۔یہ نخلستان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔تیرم شہر کا گلیشیر ۱۷ میل لمبا اور ڈیڑھ سے دو میل چوڑا ہے۔فینی نے بلتیوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس قدیم شہر میں یارقندی (ترکی) آباد تھے اور یہاں وہ بلتیوں کے ساتھ پولو کھیلتے تھے۔اس کے پڑوس میں گیھاری نام کا بلتیوں کا گاؤں تھا۔یارقندی یہاں مویشی لوٹنے آتے تھے۔تب گیھاری میں گنجان آبادی تھی۔ایک مرتبہ یارقندیوں نے گاؤں میں کام کر رہی ایک بلتی عورت کو اغوا کیا۔ پہاڑ سے آئے ایک برفانی طوفان سے یہ شہر تباہ ہو گیا۔

گیاری یا گیھاری وہی مقام ہے جہاں ۷/اپریل ۲۰۱۲ کو ۱۲۰ سے زائد پاکستانی فوجی برفانی تودوں کے نیچے دب گئے تھے۔یہ سانحہ صبح پانچ بج کر پینتالیس منٹ پر پیش آیا تھا۔ یہاں پہاڑ کے دامن میں بٹالین ہیڈ کوارٹر تھا اور بڑے بھاری ہتھیار رکھے تھے۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پانچ میل کے رقبے میں گلیشیر ٹوٹ کر نیچے آیا تھا اور فوجی اس کی زد میں آئے تھے۔

گیاری ۱۳۰۳۹ فٹ بلند ہے۔اس کی پشت پر بیلافونڈ گلیشیر ہے۔

فینی اوراس کی جماعت نے ۱۹۱۱ءاور ۱۹۱۲ء کی گرمیوں میں اپنی مہموں کے دوران تیرم شہر، علی برانگسا اور شمالی کیمپ پر پتھروں سے بنی ۸ پناہ گاہیں، دو Cairns (پتھروں سے بنی گاؤدم شکل کی یادگار) اور پتھروں کا بنا ایک دائرہ دیکھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ماضی میں خطے کے لوگ اسی راستے سیاچن اور بلافون سے ترکستان اور نوبراہ جاتے تھے۔ ڈاکٹر ٹی جی لونگ سٹاف کے مطابق بلتی مسافر بلتستان سے نوبراہ جانے کے لئے بلافون درے کو بطور قریبی راستہ (short cut) استعمال کرتے تھے۔ لونگ سٹاف نے ۱۹۰۹ء میں سیاچن کا مختصر سروے کیا تھا۔ فینی نے لونگ سٹاف کے بیان کو صحیح بتایا ہے۔ کرنل گوڈوین آسٹین کا بھی خیال ہے کہ نقشہ کے مطابق بلتستان کے لوگ غالباً سالتورو سے یارقند جاتے تے۔ گوڈوین آسٹین نے کے ٹو دریافت کیا تھا۔

ایک بلتی لیڈر اور قلم کار فدا محمد ناشاد کی ملاقات گونما گاؤں میں لگ بھگ سو سالہ ایک عمر رسیدہ بزرگ محمد ابراہیم سے ہوئی۔ وہ سیاچن سے دو دفعہ لداخ گیا تھا۔ پہلی مرتبہ غالباً ۱۹۲۹ء اور دوسری مرتبہ ۱۹۳۳ء میں سیاچن کو عبور کر کے ۱۸۲۰۰ فٹ بلند چولونگ لا کے راستے نوبراہ کے وارث گاؤں پہنچا تھا اور وہاں سے لیہ روانہ ہوا تھا۔

کپتان ہنری اسٹریچی پہلا یورپی تھا جس نے پہلے پہل اکتوبر ۱۸۴۸ء میں سیاچن کا لمبا گلیشیر دیکھا۔ وہ اس پر دو میل چلا۔ ۱۸۲۷ء میں برطانی ہند کے گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ نے ہنری اسٹریچی سمیت دو اہل کار میجر الیگزنڈر کنینگھم اور ڈاکٹر تھامس تھامسن کو سروے اور تحقیقی کام کے لئے لداخ بھیجا۔ خفیہ طور پر انہیں جاسوسی کا کام بھی سونپا۔ گورنر جنرل نے اس سے پہلے مئی ۱۸۴۷ء میں تبتی سرحدی کمیشن قائم کیا تھا۔

مشن کی تکمیل کے بعد تینوں انگریز افسروں نے اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کی۔ کنینگھم نے Ladakh-Physical, Statistical and Historical مطبوعہ (۱۸۵۳ء) کے نام سے لداخ سے متعلق ایک تحقیقی اور علمی کتاب لکھی جو ایک حوالہ جاتی تصنیف کے طور پر ایک اچھا ماخذ مانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر تھامس تھامسن نے

Western Himalaya and Tibet (۱۸۵۲ء) کے نام سے لداخ کے پیڑوں، جڑی بوٹیوں اور جھاڑیوں پر ایک کتاب تصنیف کی۔ خطے سے متعلق اسٹریچی کی رپورٹ بھی شائع ہوئی ہے۔

ٹی جی لونگ سٹاف پہلا یورپی محقق کوہ پیما تھا جس نے سیاچن گلیشیر کا سروے کیا۔ وہ ۱۹۰۹ء میں بولافون درہ عبور کر کے سیاچن گلیشیر پہنچا اور بڑے بڑے برفانی تودوں اور کھائیوں سے ہوتا ہوا ریموگلیشیر کے دہانے پر پہنچا۔ وہاں سے وہ سیاچن گیا۔ لونگ سٹاف نے دیکھا کہ سیاچن مزید شمال کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ لونگ سٹاف نے اس کا طاس دیکھا۔ انہوں نے سیاچن پر صرف ڈھیر دو دن گزارے۔ اپنے سفر کے دوران لونگ سٹاف ایک مرتبہ ایک گہری برفانی کھائی میں گرا اور دوسری مرتبہ ایک برفانی تودے میں پھنس گیا اور بڑی مشکل سے جان بچی۔

امریکی شہری فینی بولاک ورک مین کا اوپر ذکر آیا ہے۔ وہ اور ان کے شوہر ولیم ہنٹر ورک مین منجھے ہوئے کوہ پیما تھے۔ انہوں نے ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء کی گرمیوں میں سیاچن گلیشیر پر تقریباً چار ماہ گزارے۔ نئی چوٹیاں اور درے دریافت کئے۔ ان کی بلندیوں کی پیمائش کی۔ ان پر چڑھے اور ان کے نام رکھے۔ ان میں کئی نام آج بھی مستعمل ہیں۔ خاص کر سیالا اور اندراکول زبان زدعام ہیں۔ اسی طرح Silver Thorn اور ترکستان لا بھی عام مروج ہیں۔ یہ نام بھی ان کے رکھے تھے۔

فینی نے سی گرانٹ پیٹرکین کی خدمات حاصل کیں، جو سروے کا اچھا تجربہ رکھتا تھا اور اس ضمن میں رایل جیوگرافیکل سوسائٹی کا ڈپلوما یافتہ تھا۔ اس کی مدد کے لئے سروے آف انڈیا کا ایک ملازم سرجن سنگھ کو ساتھ لیا۔

فینی کی مہم کی روداد پہلے جیوگرافیکل جرنل میں چھپی۔ بعد میں یہ کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب نایاب تھی۔ راقم الحروف کی استدعا پر امریکہ میں مقیم ایک دوست نے اس کی فوٹو کاپی بھیجی جس سے ماخوذ چند اقتباسات یہاں زیرنظر مضمون

میں پیش کیئے جاتے ہیں۔

سیاچن گلیشیر کے سروے سے پہلے مصنفہ نے پانچ مہمات میں حصہ لیا اور آٹھ مرتبہ کوہ پیمائی کی۔ میں نے اپنی کتاب 'لداخ: محققوں اور سیاحوں کی نظر میں' (مطبوعہ ۲۰۱۱ء) میں فینی اور ولیم کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے جو تقریباً دو صفحات پر محیط ہیں۔ جس کے لئے میں نے مذکورہ کتاب کے علاوہ دو اور کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ میں اپنی کتاب کی جزئیات کو یہاں نقل کرتا ہوں جن سے فینی اور اس کے شوہر ولیم کی زندگی کا پس منظر اور مہم جویانہ سرگرمیوں کی جانکاری ہوتی ہے:

''امریکی میاں بیوی فینی بولوک ورک مین اور ولیم ایچ ورک مین ۱۸۹۸ء کی گرمیوں میں لیہ آئے جہاں سے وہ نوبراہ اور مشرقی ترکستان کی سرحد تک گئے۔ کوہ پیمائی کی۔ پھر زنسکار روانہ ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں دیوسائی سے سکردو اور شگر چلے گئے۔ تب سے ۱۹۱۲ء تک دونوں میاں بیوی نے خطے میں ۵ مہمات میں حصہ لیا اور آٹھ مرتبہ کوہ پیمائی کی۔ آٹھ ضخیم کتابوں میں انہوں نے ان کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ ان سے پہلے کرنل گوڈوین آسٹین، کرنل ینگ ہاسبنڈ اور سر مارٹن کونوے نے قراقرم میں دشت نوردی اور کوہ پیمائی کی تھی۔ ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء میں فینی ورک مین اور ولیم مین نے شمالی بلتستان میں ۳۰ میل لمبا چوگولونگما گلیشیر دریافت کیا۔ فینی نے اسے ۲۲۵۶۸ فٹ بلند پایا۔ سیون ہیڈین نے ولیم اور فینی کے ان یخ بستہ پہاڑوں کی دریافت کو دنیا کے لئے ایک اہم واقعہ قرار دیا ہے۔

دونوں میاں بیوی کی اہم ترین دریافت سیاچن یا گل گلاب گلیشیر ہے۔ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء کی مہمات میں انہوں نے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔ فینی نے اسے عظیم گل گلاب یا سیاچن کی فتح، اور دنیا کا طویل ترین 'قطبی گلیشیر' کہا ہے۔ کسی کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ ۴۸ میل لمبا گل گلاب گلیشیر ۷۲ سال بعد دنیا کا بلند ترین میدان جنگ میں تبدیل ہوگا۔ فینی نے سیاچن پر اپنی دوسری کتاب Two Summers in

the Ice wilds of Eastern Karakoram میں ۱۹۱۱ءاور۱۹۱۲ء کے سیاچن کی مہم کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔اس میں ۱۴۱ خوبصورت تصویریں ہیں۔ایک تصویر میں فینی لگ بھگ ۲۱ ہزار فٹ بلند چوٹی پر اسکرٹ اور جیکٹ میں ملبوس ایک اخبار پڑھ رہی ہے جس پر 'عورتوں کے حق ووٹ' کی سرخی بھی ہے۔فینی کے سامنے اس کے یخ توڑنے کی کلہاڑی برف میں دھنسی ہے۔۱۹۱۲ء کی مہم کے دوران فینی اور ولیم نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیاچن دیکھا۔ان کے ہمراہ کئی یورپی اور ۶۶ قلی وغیرہ تھے۔آج سیاچن کا نام ساری دنیا نے سنا ہے۔ان دنوں بقول فینی ورک مین اس کے ہمسایہ میں رہنے والے نوبراہ کے لوگوں کو بھی سیاچن کا بہت کم علم تھا۔''

اگست ۱۹۱۱ء میں فینی اور اس کی ٹیم نے ۲۵ روز سیاچن پر گزارے۔۱۹۱۲ء میں وہ ۵/جون کو سرینگر سے بلتستان کے لئے نکلی اور سیاچن سے پہلے آخری اہم گاؤں خپلو پہنچی۔خپلو کا راجا شیر علی خان فوت ہوا تھا اور اس کا بھتیجا ناصر علی خان حکمراں بنا تھا۔راجا نے اپنا ایک معتمد وزیر عبدالکریم کو فینی کی جماعت میں کام کرنے کے لئے دیا۔بقول فینی وہ بڑا محنتی اور شریف النفس آدمی تھا۔۲/جولائی کو وہ آخری گاؤں گونما پہنچے۔فینی لکھتی ہے کہ ان کے پہنچنے سے پہلے مولویوں نے قلیوں کو تعویذ دیا تھا اور ان کے حق میں دعائیں مانگی تھیں۔جن کے عوض وہ مولویوں کو معاوضہ دیتے تھے۔تعویذ گلے پر باندھتے تھے۔گونما سے وہ گیہاری آئے۔نارم گلیشیر سے پہلے انہوں نے نے پہلا کیمپ لگایا۔۱۹۱۱ء کی مہم کے دوران فینی نے نارم سے آگے ۷۰۰۰ افٹ کی بلندی پر پتھروں سے تعمیر کی ہوئی ۸ پناہ گاہیں دیکھی تھیں۔تاہم کھانا پکانے کے لئے کوئی چولہا چوکا وغیرہ نہیں دیکھا۔اس سے یہ عیاں تھا کہ ماضی قریب میں یہ پناہ گاہیں استعمال نہیں ہوتی تھیں۔

اب کے ایک باربردار قلی Cesare Chenoz اپنی بے احتیاطی سے ۸۰ فٹ گہری کھائی میں گر گیا۔اس کو زندہ نکالا گیا اور اعلیٰ برانگسا لیا گیا جہاں رات کو وہ فوت

ہو گیا۔فینی نے ایک چوٹی کا نام تعویذ رکھا۔ ماضی میں مسافر بلتی یہاں یارقندیوں کی جارحیت سے محفوظ رہنے اور بقول فینی موخرالذکر کو نقصان پہنچانے کی نیت سے تعویذ چڑھاتے تھے۔۱۹۱۱ء میں ڈاکٹر ولیم ایچ ورک مین نے گلیشیر کے طاس کا سروے کیا تھا اور سب سے بڑا معاون دریا دریافت کیا۔۱۹۱۲ء کی مہم کے دوران وہ سبھی سیاچن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گئے اور اس کے شمالی اور مشرقی منبعوں تک پہنچے۔ وہ وادی سالتورو کی جانب سے بلافون لا عبور کر کے بولوفرنڈ مونٹ گلیشیئر سے ہوتے ہوئے سیاچن گلیشیئر پہنچے تھے۔

فینی کہتی ہے گلیشیر کی لمبائی ۴۶ میل ہے (نئے سروے کے مطابق اس کی لمبائی ۴۸ میل ہے)۔۲۵ میل کے فاصلے پر اس کی چوڑائی ڈھائی سے پونے تین میل ہوتی ہے۔غالباً پہلی مرتبہ انہوں نے دنیا کو سیاچن گلیشیر کی لمبائی اور چوڑائی سے آگاہ کیا۔

ایک جگہ انہوں نے پتھروں کا بنایا ہوا ایک دائرہ دیکھا جس کا قطر ۱۲ فٹ تھا۔یہ Linches سے ڈھکا ہوا تھا اور لکھا ہے کہ کسی نے انہیں برسوں سے نہیں چھوا ہے۔ دائرہ کے اندر کیل کے بڑے بڑے سینگ تھے۔

فینی لکھتی ہے کہ یہ مقامی لوگوں کا بنایا ہوا لگتا ہے۔ٹیم نے کئی مقامات پر لومڑی اور دوسرے جانوروں کے پیر کے نشانات دیکھے۔ انسانی قدموں کی آواز سے وہاں رام چکور اڑے۔ انہیں بھورے رنگ کے بہت سے چھوٹے پرندے نظر آئے۔فینی نے اٹلی میں الپس پر ایسے پرندے دیکھے تھے۔گائیڈ نے انہیں برفانی پرندہ بتایا۔

۱۹۱۱ء میں اس سے آگے انہوں نے دو جھیلیں دیکھی تھیں جہاں انہوں نے ۱۶۲۰۰ فٹ کی بلندی پر کیمپ لگایا تھا۔ یہاں فینی نے بڑے بڑے کیلوں کو گھاس چرتے دیکھا تھا۔

علی برانگسا سے تین کوے ان کے کیمپ کے ساتھ ساتھ اڑے اور آخر تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ ان کوؤں کو اپنے لئے نیک شگون سمجھتے تھے۔فینی لکھتی ہے یہ کوے بڑے اور اچھے خاصے تھے۔۲۰ ہزار فٹ کی بلندی پر بھی ان پر ناسازگار آب وہوا کا برا

اثر نہیں پڑا تھا۔ آج کل بھی سیاچن پر تعینات فوجیوں نے کوؤں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ انہوں نے Cairns دیکھے جو تقریباً ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔

سیاچن میں فینی نے ایک جگہ اپنے ایک کیمپ پر Cairns دیکھے۔ وہ سوچتی ہے، اس الگ تھلگ مقام پر Cairns کا ہونا بتاتا ہے کہ بلتستان یا نوبراہ سے مسافر ترکستان جانے کے راستے کی تلاش میں اس مقام تک پہنچے ہوں گے اور سامنے برفانی پہاڑ دیکھ کر لوٹے ہوں گے۔ فینی کے خیال میں اس قیاس آرائی کا اطلاق تیرم شہر کے پتھروں سے بنا دائرے پر بھی ہوتا ہے۔

آگے چل کر انہوں نے دو مخروطی برفانی چوٹیاں دیکھیں۔ ان کو فینی نے Silver Throne (چاندی کا تخت) اور Lower Silver Throne (نشیبی چاندی کا تخت) نام دیئے۔ مہم کے ارکان نے اس سفر کے دوران ننگی چٹانیں اور چھوٹی چھوٹی جھیلیں نہیں دیکھیں۔ جن کی سیاچن گلیشیر پر بہتات ہیں۔ اس بات کو لے کر قلیوں نے آہ وزاری کی۔ مصنفہ نے ملکہ میری سے اجازت لے کر ایک چوٹی کا نام Queen Mary Peak رکھا۔ اس کی بلندی ۲۴۳۵۰ فٹ تھی۔ ۲۳۲۷۰ فٹ بلند چوٹی کا نام وائسرائے سے منسوب کیا اور Mount Harding رکھا۔ فینی نے اس سے قبل پاس پاس واقع تین چوٹیوں کا نام شاہ جارج پنجم کے گروپ کے نام سے موسوم کیا تھا۔ اس سلسلے میں انگریز بادشاہ جارج پنجم سے باقاعدہ اجازت حاصل کی تھی۔ فینی نے ایک چوٹی کا ذکر کیا ہے، جہاں سے شاہ جارج پنجم کی گروپ چوٹیاں اور گاشیر بوم نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔

پٹیر کین نے نشیبی سیاچن سے نوبراہ تک نقشہ کشی کی تھی۔ فینی لکھتی ہیں:

''خاص دھیان دینے کے باوجود ہمیں وہ Cairns نظر نہیں آیا۔ جس کا ان کے خاکہ میں ذکر ہے۔'' فینی رقم طراز ہے:

''گونما سے آتا ہوا ایک قلی گلیشائی دریا میں گرا تھا۔ اس کے ساتھ ایک صندوق

ہو گیا۔فینی نے ایک چوٹی کا نام تعویذ رکھا۔ ماضی میں مسافر بلتی یہاں یارقندیوں کی
جارحیت سے محفوظ رہنے اور بقول فینی موخر الذکر کو نقصان پہنچانے کی نیت سے تعویذ
چڑھاتے تھے۔۱۹۱۱ء میں ڈاکٹر ولیم ایچ ورک مین نے گلیشیر کے طاس کا سروے کیا
تھا اور سب سے بڑا معاون دریا دریافت کیا۔۱۹۱۲ء کی مہم کے دوران وہ سبھی سیاچن
کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گئے اور اس کے شمالی اور مشرقی منبعوں تک
پہنچے۔ وہ وادی سالتھورو کی جانب سے بلافون لا عبور کر کے بولوفرنڈ مونٹ گلیشیئر سے
ہوتے ہوئے سیاچن گلیشیئر پہنچے تھے۔

فینی کہتی ہے گلیشیر کی لمبائی ۴۶ میل ہے (نئے سروے کے مطابق اس کی لمبائی
۴۸ میل ہے)۔۲۵ میل کے فاصلے پر اس کی چوڑائی ڈھائی سے پونے تین میل ہوتی
ہے۔غالباً پہلی مرتبہ انہوں نے دنیا کو سیاچن گلیشیر کی لمبائی اور چوڑائی سے آگاہ کیا۔

ایک جگہ انہوں نے پتھروں کا بنایا ہوا ایک دائرہ دیکھا جس کا قطر ۱۲ فٹ تھا۔ یہ
Linches سے ڈھکا ہوا تھا اور لکھا ہے کہ کسی نے انہیں برسوں سے نہیں چھوا ہے۔
دائرہ کے اندر کیل کے بڑے بڑے سینگ تھے۔

فینی لکھتی ہے کہ یہ مقامی لوگوں کا بنایا ہوا لگتا ہے۔ٹیم نے کئی مقامات پر لومڑی
اور دوسرے جانوروں کے پیر کے نشانات دیکھے۔ انسانی قدموں کی آواز سے وہاں
رام چکور اڑے۔انہیں بھورے رنگ کے بہت سے چھوٹے پرندے نظر آئے۔فینی
نے اٹلی میں الپس پر ایسے پرندے دیکھے تھے۔گائڈ نے انہیں برفانی پرندہ بتایا۔

۱۹۱۱ء میں اس سے آگے انہوں نے دو جھیلیں دیکھی تھیں جہاں انہوں نے ۱۶۲۰۰ فٹ
کی بلندی پر کیمپ لگایا تھا۔یہاں فینی نے بڑے بڑے کیلوں کو گھاس چرتے دیکھا تھا۔

علی برانگسا سے تین کوے ان کے کیمپ کے ساتھ ساتھ اڑے اور آخر تک ان کا
ساتھ نہیں چھوڑا۔وہ ان کوؤں کو اپنے لئے نیک شگون سمجھتے تھے۔فینی لکھتی ہے یہ کوے
بڑے اور اچھے خاصے تھے۔۲۰ ہزار فٹ کی بلندی پر بھی ان پر نا سازگار آب وہوا کا برا

اثر نہیں پڑا تھا۔آج کل بھی سیاچن پر تعینات فوجیوں نے کوؤں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ایک جگہ انہوں نے Cairns دیکھے جو تقریباً ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔

سیاچن میں فینی نے ایک جگہ اپنے ایک کیمپ پر Cairns دیکھے۔وہ سوچتی ہے، اس الگ تھلگ مقام پر Cairns کا ہونا بتاتا ہے کہ بلتستان یا نوبراہ سے مسافر ترکستان جانے کے راستے کی تلاش میں اس مقام تک پہنچے ہوں گے اور سامنے برفانی پہاڑ دیکھ کر لوٹے ہوں گے۔فینی کے خیال میں اس قیاس آرائی کا اطلاق تیرم شہر کے پتھروں سے بنا دائرے پر بھی ہوتا ہے۔

آگے چل کر انہوں نے دو مخروطی برفانی چوٹیاں دیکھیں۔ان کو فینی نے Silver Throne (چاندی کا تخت) اور Lower Silver Throne (نشیبی چاندی کا تخت) نام دیئے۔مہم کے ارکان نے اس سفر کے دوران ننگی چٹانیں اور چھوٹی چھوٹی جھیلیں نہیں دیکھیں۔جن کی سیاچن گلیشیر پر بہتات ہیں۔اس بات کو لے کر قلیوں نے آہ وزاری کی۔مصنفہ نے ملکہ میری سے اجازت لے کر ایک چوٹی کا نام Queen Mary Peak رکھا۔اس کی بلندی ۲۴۳۵۰ فٹ تھی۔۲۳۲۷۰ فٹ بلند چوٹی کا نام وائسرائے سے منسوب کیا اور Mount Harding رکھا۔فینی نے اس سے قبل پاس پاس واقع تین چوٹیوں کا نام شاہ جارج پنجم کے گروپ کے نام سے موسوم کیا تھا۔ اس سلسلے میں انگریز بادشاہ جارج پنجم سے باقاعدہ اجازت حاصل کی تھی۔فینی نے ایک چوٹی کا ذکر کیا ہے، جہاں سے شاہ جارج پنجم کی گروپ چوٹیاں اور گاشیر بوم نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔

پٹیر کین نے نشیبی سیاچن سے نوبراہ تک نقشہ کشی کی تھی۔فینی لکھتی ہیں:

”خاص دھیان دینے کے باوجود ہمیں وہ Cairns نظر نہیں آیا۔جس کا ان کے خاکہ میں ذکر ہے۔“ فینی رقم طراز ہے:

”گونما سے آتا ہوا ایک قلی گلیشائی دریا میں گرا تھا۔ اس کے ساتھ ایک صندوق

تھا جس میں ایک تھیلے میں سکے اور دوسرے میں میرے ذاتی کپڑے تھے۔ وہ اس صندوق کو چھوڑ کر آیا۔ ایک روز بعد گائیڈ اور چند قلی لینے گئے۔ بہت تلاش کے بعد انہوں نے چھ فٹ پانی کے نیچے دو تھیلے دیکھے۔ ایک قلی نے غوطہ مار کر انہیں نکالے۔ تاہم بہت سارے سکے اور میرے کپڑے نالے میں نیچے بہہ گئے تھے۔ چند قلی صبح صبح کئی روز سکوں کی تلاش میں نکلتے۔ میں نے سنا کہ ان کی محنت بر آتی۔"

آگے وہ لکھتی ہیں: "جوں جوں دن گزرتے تھے ہم سب بلندیوں کی وجہ سے کم کھانا کھانے لگے۔ رات کو نیند کم آنے کی شکایت بھی رہتی تھی۔ ہم نے ماسوائے تین چار روز چار ہفتے ۱۶۶۰۰ فٹ سے زیادہ بلندی پر سفر کیا تھا۔ اکثر ۱۷۰۰۰ فٹ سے زیادہ اونچائی پر سفر کیا۔ ہمارے ساتھ ۶۶ قلی تھے۔ ۲۱/ اگست کو تین (کولے) آگے آگے اڑتے ہوئے پرانے برفانی کیمپ کی طرف اترے۔"

اسکے بعد کوؤں کا ذکر نہیں ہے۔ اب سفر کے کم دن بچے تھے۔ فینی کی پارٹی کو یخ پر چلتے ہوئے اکثر کھائیوں سے پالا پڑا۔ کبھی ایک بڑی کھائی کی وجہ سے سیدھے راستے سے ہٹ کر لمبا چکر لگانا پڑتا تھا۔ ایک چٹان پر فینی نے کالی سیاہی سے اپنا نام مختلف حروف میں F.B.W لکھوایا۔ اس کے ساتھ ایک ڈھلوان چوٹی پر ایک Cairns تعمیر کیا۔

وہ لکھتی ہیں:

"ایک روز صبح ساڑھے چھ بجے خیمے میں میرے نیچے گلیشیر ہلنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ یخ بیخ و بن سے اکھڑ رہا ہے۔ اس کے فوراً بعد پونا گھنٹہ تک برف کے تودے گرنے سے گڑگڑ ہٹ کی آواز آتی رہی۔ تھوڑے سے وقفے کے لئے لیکن بڑی شدت سے میں آگے پیچھے جھولنے لگی۔"

فینی کو سرینگر میں زلزلہ کا تجربہ ہوا تھا۔ چنانچہ وہ بے ساختہ بولی:

"کاش! میں خیمے میں ہوتی تو اتنی کوفت نہیں ہوتی۔"

وادی سلتورو میں یہ زلزلہ زیادہ شدت کا تھا جس سے بہت سارے مکانات ڈھ گئے تھے اور مویشی مر گئے تھے۔ وادی کندوس میں دو دن گرد و غبار سے اندھیرا چھایا رہا۔ دو پہر کو دوسری جگہ پہنچنے پر ایک اونچی چٹان سے لگاتار بڑے بڑے پتھر گڑگڑاہٹ کے ساتھ لڑھکنے لگے۔ جہاں پر گرتے وہاں گرد و غبار کے بادل اٹھتے تھے۔ رات کے دس بجے تک یہ صورت حال رہی۔

فینی رقم طراز ہیں:

''۱۹۱۱ء میں مہم کی ٹیم ۲۰ راگست سے ۱۵ رستمبر تک سیاچن گلیشیر پر رہی۔ ۱۹۱۲ء میں جولائی اور اگست کے پورے مہینے گلیشیر پر گزارے۔ دونوں سال موسم اچھا رہا۔ اسی دوران ہندوستان میں جنوب مغربی مون سون ہلکی رہی۔ لیکن کشمیر میں بڑی خشک سالی رہی۔ چپلو میں جولائی اور اگست کے دوران تقریباً بالکل بارش نہیں پڑی اور مشرقی قراقرم میں دونوں سال موسم سازگار رہا۔'' ۱۳-۱۹۱۲ء میں اطالوی محقق ڈی فلیپی اور ۱۹۲۹ء میں دوسرا اطالوی مہم جو ڈینیلی سیاچن کی مہم پر روانہ ہوئے۔ ڈی فلیپی اور ڈینیلی کی سیاچن مہمات کے ۲۲ سال بعد ۱۹۳۴ء میں G.O. Dryen Furth کی بین الاقوامی کوہ پیما مہم نے بلتورو گلیشیر کی جانب سے سیاکنگری کو سر کیا۔

تقسیم ملک کے بعد ۱۹۵۷ء سے ۱۹۸۴ء تک بیس سے زائد غیر ملکی کوہ پیماؤں نے حکومت پاکستان کی اجازت سے سیاچن گلیشیر کے علاقے میں قراقرم درہ کے جنوب میں واقع مشہور چوٹیوں کو سر کیا یا ان چوٹیوں پر پہنچنے کی کوشش کی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

۱۹۵۷ء میں برطانی امپیریل کالج کی جماعت نے Eric Shipton کی قیادت میں بلافون لا کو عبور کر کے سیاچن گلیشیر، تیرم گلیشیر اور کے ۱۲ چوٹیوں کا مطالعاتی دورہ کیا۔

۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۲ء میں دو اسٹریلوی کوہ پیما جماعتوں نے سیاکنگری کو سر کیا۔ ان دو سالوں میں پاکستان۔ جاپان سولترو مہم سمیت تین جاپانی کوہ پیما جماعتیں سیاچن

گلیشیر علاقے میں گئیں۔ پاک۔ جاپان مشترکہ مہم نے سلتورو کنگری کو پہلی دفعہ سر کیا۔
۱۹۷۵ء میں Swiss Alres Tour نے سیا کنگری اور ۱۹۷۸ء میں مغربی جرمنی کی گلیشیر ٹریکینگ پارٹی نے بلافون لا سے سیاچن اور کندوس کی ٹریکنگ کی۔
۱۹۷۹ء میں جاپان کی تین ٹیموں نے سیاچن علاقے میں کئی چوٹیاں سر کیں۔
۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۱ء میں امریکی، مغربی جرمنی اور جاپانی کوہ پیما ٹیموں نے علاقے کا دورہ کیا ایک امریکی سکیٹینگ اور ٹریکنگ ٹیم نے بلافون لا اور بولوفونڈ گلیشیر پر سکیٹینگ اور ٹریکنگ کی۔ جاپان کوپے یونیورسٹی کی ٹریکینگ پارٹی نے بلافون اور بولوفونڈ گلیشیر کی ٹریکنگ کی۔
اپریل ۱۹۸۴ء میں حکومت پاکستان نے جاپان ہری ساکی یونیورسٹی کی کوہ پیما جماعت کو ۷۳۸۵ میٹر بلند ریمو چوٹی کو سر کرنے کی اجازت دی تھی۔ اسی سال اسٹرین آکاریکس ایکسپیڈیشن کو یکم جون سے ۷۴۶۸ میٹر بلندی کی ۱۲ چوٹیاں سر کرنے کی اجازت دی تھی لیکن اپریل میں بلافون اور سیالا پر ہندوستانی فوج کی موجودگی سے مذکورہ مہمات سرانجام نہیں دے پائیں اور سیاچن بتدریج میدان جنگ میں تبدیل ہوا۔
ان واردات کے اسباب اور عوامل سمجھنے کے لئے ہمیں چند سال پیچھے مڑنا ہوگا اور حالات کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ ۱۹۷۷ء میں ہندوستان کے High Altitude Warfare School (HAWS) کے افسر کرنل نریندر کمار نے کوہ پیمائی کے ایک جریدہ میں سیاچن علاقہ میں پاکستانی حکومت کی اجازت پر آئی ایک کوہ پیما مہم سے متعلق پڑھا۔ کرنل نے اپنے اعلیٰ افسروں کو آگاہ کیا اور سیاچن کی مہم پر روانگی کا منصوبہ پیش کیا۔ چنانچہ ۱۹۷۸ء میں کرنل نریندر کمار کی قیادت میں ایک کوہ پیما ٹیم سیاچن گلیشیر پہنچی۔ ٹیم اگست سے اکتوبر تک علاقے میں رہی۔ اخباری رپورٹ کے مطابق اس نے ۲۴۶۳۱ فٹ بلند تیرم کنگری سمیت کئی چوٹیاں سر کیں اور گلیشیر کی پیمائش کی۔ اس

مہم کی روداد ۸۰۔ ۱۹۷۹ء کے ہمالین جرنل اور Illustrated weekly of India کے ۳۱۔۲۳ مئی /۱۹۷۹ء کے شمارے میں چھپی ۔ٹائمز آف انڈیا کی ایک خبر کے مطابق پاکستانیوں نے علاقے میں ہندوستانی برانڈ کے سگریٹ کا مروڑا ہوا ایک خالی پیکٹ دیکھا۔

اسی دوران ایک لداخی فوجی افسر کرنل ستبدن نے بھی علاقے کا سروے کیا اور اپنی رپورٹ دی۔ پاکستان نے پہلی مرتبہ ۱۸/اپریل ۱۹۷۸ء کو سیاچن پر ہندوستانی فوجی دیکھے، جب میجر جرنیل غلام محمد ملک ،ڈپٹی ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز ہیلی کاپٹر میں سیالا کے پاس ہیلی کاپٹر میں پرواز کرر ہاتھا۔تب پاکستان نے دروں پر اپنے فوجی بھیجے۔

اس سے پہلے پاکستان اپنے نقشے میں پورے سیاچن اور قرب وجوار کے گلیشیروں کو اپنا علاقہ دکھاتا رہا تھا۔جس سے ہندوستان نے Cartographic Aggression (نقشہ کشی کی جارحیت) سے محمول کیا۔

امریکہ نے بھی ۱۹۸۰ء کی دہائی میں اپنے نقشوں میں سیاچن گلیشیر کو پاکستان کی قلمرو میں دکھایا تھا۔

ستمبر ۱۹۸۰ میں کرنل نریندر کمار کی قیادت میں ۱۴افسروں اور ۴۰ جوانوں پر مشتمل ایک جماعت سیاچن علاقے میں پہنچی ۔یہ افسران اور جوان ہائی الٹی ٹیوڈ وار فیر سکول کے تربیت یافتہ تھے۔ یہ جماعت سیا اور سلتورو کنگری تک گئی ۔کرنل نریندر کمار نے ہمالین جرنل میں لکھا تھا کہ اس کوہ پیما جماعت کو فضائیہ کی مدد حاصل تھی۔

ہندوستان نے الزام لگایا کہ ۱۹۸۰ء میں تیرم کنگری کی مہم پر جانے والی ٹیم کی ٹوہ میں پاکستان کے ایک سپر جیٹ نے چار مرتبہ پرواز کیا۔

ایک ہندوستانی کوہ پیما ٹم نے سیاچن علاقے میں ۲۳۳۹۰فٹ بلند Apsarasas چوٹی سر کی ۔ پاکستانی میڈیا (ذرائع ابلاغ) کے مطابق مئی/۱۹۸۱ء میں چند ہندستانی فوجی اور سول افراد وادی سلتورو میں گونما اور چولونگ گاؤں تک

آئے تھے۔ اسکردو کے سپر نٹنڈنٹ پولیس نے اگست ۱۹۸۱ء میں ان علاقوں کا دورہ کیا اور مقامی لوگوں سے ہندوستانی فوجیوں کے چھوڑے ہوئے لداخ اسکاوٹس کے جوانوں کی ٹوپی کے بیج (badge) اور کچھ ہندوستانی کرنسی کے نوٹ حاصل کئے۔
۲۰ مارچ ۱۹۸۲ء کو پاکستانی وزادت خارجہ نے اسلام آباد میں ہندوستانی سفارت خانہ اور دہلی میں وزارت خارجہ کو تحریری طور پر الزام لگایا کہ ہندوستان نے سرحدی خلاف ورزیاں کی ہیں۔ اسی اثنا میں ٹائم میگزین کے مطابق پاکستانی حکومت نے لندن کے ایک فرم کو کوہ پیمائی کے ملبوسات کے لئے حکم دیا۔ یہ فرم ہندوستان کو بھی ایسے ملبوسات فراہم کرتا تھا۔ ہندوستان کو خدشہ ہوا کہ پاکستان سیاچن علاقے میں اپنی پوزیشن مضبوط بنا رہا ہے کیونکہ ہندوستان بھی سیاچن پر اپنا حق جتا رہا تھا۔

جولائی ۱۹۸۲ء میں پاکستان نے علاقے میں پولیس اور سروے ملازم بھیجے۔ دوسرے سال اسپیشل سروسز گروپ کے اسی نوجوان تعینات کئے۔ اسی دوران ہندوستان نے دو گشتی دستے روانہ کئے۔

اگست ۱۹۸۳ء میں سیاچن گلیشیر کے علاقے میں لداخ اسکاوٹس جوانوں کے ایک دستے کا پاکستانی فوج کے ایک گشتی دستے سے تقریباً آمنا سامنا ہوا۔ تاہم گولیوں کا تبادلہ نہیں ہوا۔

۲۱ اگست ۱۹۸۳ء کو پاکستان کے شمالی سیکٹر کے کمانڈر نے ہندوستانی شمالی کمان کے افسر اعلیٰ جرنیل منوہر لال چھبر کو ایک مراسلہ میں سیاچن سے فوج ہٹانے کے لئے کہا۔ جرنیل چھبر نے جواب میں احتجاج کیا کہ پاکستان نے ہندوستانی ہوائی علاقے کی خلاف ورزی کی ہے۔ نیز ہندوستانی علاقے میں ۲۵ میل اندر گھس آنے کا الزام لگایا۔

یہ وارداتیں سیاچن کے لئے دونوں ملکوں کے درمیان تصادم اور تنازعہ کا پیش خیمہ تھیں۔ چنانچہ اپریل ۱۹۸۴ء میں ہندوستان نے آپریشن میگھ دوت کے نام سے

بولافون لا اور سیالا پر لداخ اسکاؤٹس اور کماؤں رجمنٹ کے جوان اتارے۔ پاکستان کے مطابق جب اس کی فضائیہ کے ایک ہیلی کاپٹر نے ان دروں کے اوپر پرواز کیا تو اس پر گولیاں چلائیں۔

ہندوستان نے سیالا پر ۱۶/ اپریل ۱۹۸۴ء کو اور بیلافون لا پر اس کے دو روز بعد ۱۸/ اپریل کو اپنی فوجیں اتاری تھیں جبکہ پاکستان کا کہنا ہے کہ ان دونوں دروں پر ۱۵/ اپریل کو فوجیں اتاریں۔ پاکستان نے بھی ان کے مقابل فوجیں لائیں۔

مئی میں جرنیل چھبر نے اگلی چوکیوں کا معائنہ کیا۔ پاکستان کی لام بندی دیکھی اور فوج کو سردیوں میں مورچہ بندی کا حکم دیا۔

کئی مبصر کہتے ہیں کہ سیاچن کی لڑائی لمبی نہیں ہونی چاہیے تھی یا اس بڑے پیمانے پر نہیں ہونی چاہیے تھی جو بتدریج دیکھنے میں آئی۔ ایک ریٹائرڈ پاکستانی جرنیل نے کہا کہ سیاچن کے ننگے پہاڑوں اور درّوں پر ہندوستان کی فوج کی آمد پر پاکستان اپنا ردعمل نہ دکھاتا اور نظر انداز کرتا تو بہتر رہتا۔ ہندوستانی فوج واپس چلی گئی ہوتی۔

ایک پاکستانی فوجی کمانڈر نے لکھا ہے کہ اس خطے میں آنا ہندوستان کی حماقت تھی اور پاکستان اپنی بقایا چوٹیوں کو اپنے قبضے میں لانے کی کوشش میں جذباتی طور احمق بن گیا۔

جرنیل چھبر نے کہا ہے کہ ہندستانی فوج کا سیاچن پر مستقل طور رہنے کا ارادہ نہیں تھا سیاچن کی جنگ ایک غلطی تھی۔

ایک خاتون صحافی Myria Macdonalad نے اپنی کتاب Height of Madness میں لکھا ہے کہ: ''ہندوستان کا مقصد سیاچن پر دعویٰ کرنا، طاقت کا مظاہرہ اور سردیوں سے پہلے لوٹنا تھا۔ پاکستان نے یہ سوچا کہ ہندوستان کا مقصد اس سے بڑا ہوگا اور یہ اندیشہ ہوا کہ ہندوستان، بلتستان پر حملہ کرے گا یا شاہراہ قراقرم پر اس کی نظر ہو۔''

تب سے سیاچن اور اس کے قرب وجوار کے گلیشیروں پر کوہ پیمائی اور ٹریکنگ بند

ہوئی ہے۔ پٹیر ہلادی نے اپنی کتاب Rimo Mountain of Silk Route
(مطبوعہ ۱۹۸۸ء) میں لکھا کہ: ”۱۹۸۸ء میں ہند۔امریکہ ایک مشترکہ کوہ پیما جماعت
کو پاکستانی چوکی سے فائرنگ کی وجہ سے اپنی مہم کو ادھورا چھوڑنا پڑا۔“

سیاچن گلیشیر پر مورچہ بندی کے بعد دونوں ملکوں کی مشکلات شروع ہوئیں۔
۱۹۸۴ء تک اسکردو کے فوجی ہیڈ کوارٹر سے ۶۵ میل خپلو تک صرف چھوٹی گاڑیوں اور
ٹریکٹر ٹرالیوں کے لئے ایک کچی سڑک موجود تھی۔ خپلو سے ۶۰ سے ۷۰ میل دور سلتورو
پہاڑی سلسلے کے مختلف دروں تک پہنچنے میں آٹھ نو روز لگتے تھے۔ رسل و رسائل کی ان
مشکلات کے پیش نظر چوکیوں اور پیکٹوں کو رسد، کمک، ہتھیار اور گولہ بارود لے جانا
کارے دارد والا معاملہ تھا۔

شروع میں ہیلی کاپٹر سے پھینکے راشن پہاڑ کے نیچے چلی جاتے یا گلیشیر کے شگاف
میں غائب ہوجاتے تھے۔ پہاڑوں پر توپیں نصب کرنے کے لئے کل پرزے
ہیلی کاپٹر سے پھینکے گئے۔ پہلے پہل سیاچن پر حادثات زیادہ ہوتے تھے، بعد میں
محفوظ راستوں پر جھنڈیاں نصب کی گئیں۔ جہاں پسیاں آتی تھیں ان کو گرایا جا
تا۔ پسیاں آنے والے راستوں پر رات کو سفر کرنا محفوظ تھا۔

پاکستانی فوجی افسر کرنل محمد ذاکر نے اپنی کتاب 'سیاچن گلیشیر: دنیا کا بلند ترین محاذ
جنگ' (مطبوعہ ۱۹۹۰ء) میں لکھا ہے:

”ایک بار بردار قلی Base Camp (انتظامی کیمپ) سے اگلی چوکی تک بشمول
اپنی خوراک زیادہ سے زیادہ ۱۵ کلوگرام وزن اٹھا کر مسلسل ۵ دن گلیشیر پر چل
کر پوسٹ پہنچتا ہے۔ پورے دس دنوں میں ایک پورٹر صرف ۱۱ کلوگرام وزن اگلی
پوسٹ پر پہنچا سکتا ہے۔ ۱۰ سے ۱۵ فیصد پورٹر بیمار ہوتے تھے۔ ایک پوسٹ پر سال بھر
کے لئے تقریباً تین ہزار کلوگرام راشن، ایمونشن وغیر مطلوب تھے۔ سولہ ہزار فٹ کی
بلندی تک عام ہیلی کاپٹر زیادہ سے زیادہ سو کلوگرام سامان لے جا سکتا ہے جبکہ ہر

پوسٹ پر جلنے والے تیل کے چولہوں کے لئے ہر دو دن بعد ۱۵ کلوگرام وزنی ایک جیری کین مٹی کے تیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک جوان کی مشکلات سے متعلق وہ لکھتا ہے:

''ان بلندیوں پر ایک صحت منداور توانا جوان مشکل سے ۱۵ کلوگرام وزن اٹھا سکتا ہے۔اس وزن کے ساتھ ہموار سطح پر بھی چلتے ہوئے ہر دس بارہ قدم کے بعد پندرہ بیس سیکینڈ کے لئے رکنا پڑتا ہے۔ پندرہ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر بھوک نہیں لگتی۔ زیادہ مشقت کی وجہ سے انسان آہستہ آہستہ کمزور سے کمزور تر ہوتا جاتا ہے۔''

آگے وہ لکھتا ہے: ''اِگلو (برفانی خیمہ) کی برف وقفے وقفے سے صاف کرنی پڑتی ہے۔ بصورت دیگر اگلو برف میں دب جاتی ہے۔اندر پانی آجاتا ہے۔ سلیپنگ بیگ اور میٹرس گیلے ہوجاتے ہیں۔سنتری کی ڈیوٹی بڑی سخت ہوتی ہے۔تیز ہواؤں سے اڑتی ہوئی برف چہرے اور آنکھوں پر منجمد ہوتی ہے۔ایسے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔''

اسی طرح ایک ریٹائرڈ ہندوستانی فوجی افسر بریگیڈیئر راجیو ولیمز اپنی کتاب The Long Road ot Siachan (۲۰۱۰ء) میں سیاچن پر معرکہ آرائی کی مشکلات کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

''ہتھیاروں کو گرمانا پڑتا ہے۔سردی اور گرمی سے بندوق کی نالی کا منہ ٹوٹ جاتا ہے۔ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے میزائل تیزی سے چلتا ہے اور ہدف پر نہیں لگتا ہے۔ مارٹر رکھا ہوا یخ پگھلنے اور ہلنے سے گولے رینج (حد نشانہ) سے آگے گرتے ہیں۔یہی صورت حال توپ کے ساتھ بھی درپیش ہے۔ پلیٹ فارم پختہ نہ ہونے کے سبب نشانہ چوک جاتا ہے۔''

لداخ اسکاوٹس کے جوان بتاتے ہیں کہ چار پانچ گولے داغنے کے بعد مارٹر برف میں دھنس جاتے تھے۔ انہوں نے چاول اور آٹے کی بوریوں پر مارٹر رکھ

کر گولے داغے تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ برف وباد کی وجہ سے تنبو اور ہٹس کی جگہیں بدلنی پڑتی ہیں۔ جب تک وہ سیاچن پر ہیں ہر طرف سفید برف نظر آتی ہے، جس سے بوریت محسوس ہوتی ہے۔ وہاں سے نکل کر جب رنگوں کی بہادر یکھتے ہیں تو عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔

رسل ورسائل کی مشکلات کا بریگیڈئیر ولیمز یوں ذکر کرتا ہے:

''۱۱۷ ایم آئی ہیلی کاپٹر سولہ ہزار فٹ کی بلندی تک اڑان بھرتا ہے۔ اس سے زیادہ بلندی پر ہلکا چیتاہ ہیلی کاپٹر جاسکتا ہے۔ یہ بیک وقت دو جوانوں کو لے جاسکتا ہے جبکہ اونچی چوکی پر ایک ہی جوان کو مع اس کے ہتھیا لیا جاسکتا ہے۔ اس کے روک سیک یا بیگ کی نقل وحمل لئے ہیلی کاپٹر دوسری اڑان بھرتا ہے...... ۱۰۵ ملی میٹر توپ کے کل پرزے کھول کر اوپر لئے جاتے ہیں اور اوپر جوڑا جاتا ہے...... ایم آئی ۲۶ ہیلی کاپٹر زیادہ سامان اور آدمی اٹھاتا ہے اور بیس کیمپ تک ہی جاتا ہے۔ اے این ۳۲ ہیلی کاپٹر گلیشیروں کے ڈروپینگ زون پر سامان پھینکتا ہے۔''

بریگیڈیئر ولیمز نے ۱۹۸۵ء میں سیاچن کی لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ تب وہ میجر تھا۔ وہ سیاچن کے محاذ پر انسانی فضلہ، غلاظت، گلی سڑی سبزیوں وغیرہ کی سنگینی کا تذکرہ کرتا ہے جو ماحول کی آلودگی کے علاوہ گلیشیر میں کثافت پیدا کر رہے ہیں اور جوانوں کی صحت پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ نیز دیکھنے میں بھی یہ برا لگتے ہیں۔ انہوں نے ایک کیمیاوی مادے کا ذکر کیا ہے جو فضلے کو کھاد میں تبدیل کرتا ہے۔

فوج کی تعینات اور لڑائی سے سیاچن پر ماحولیات کو نقصان پہنچ رہا ہے، اس کے بارے میں وقتاً فوقتاً لکھا جاتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق عام کوڑا کرکٹ، کارتوسوں کے خول وغیرہ کے علاوہ روزانہ گلیشیر کے شگافوں میں ایک مکعب ٹن غلاظتیں جذب ہوتی ہیں جن سے دریائے سندھ کا پانی کثیف ہو رہا ہے۔ گلیشیر پر بہت سارے مقامات پر برف سیاہ نظر آتی ہے۔

یہی عوامل ہیں جن سے دونوں ملکوں کو سیاچن پر روزانہ کروڑوں روپے خرچ کرنا پڑ رہا ہے۔ بریگیڈیئر ولیمز نے ایک افسر، ایک جونیئر افسر اور سات جوانوں پر مشتمل ایک دستے کا ذکر کیا ہے جس کو پاکستان کی ۲۱۱۵۳ فٹ بلند دیکھ بھال چوکی (O.P.) کی ٹوہ لینے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اس چھوٹے سے گشتی دستے کو بٹالین ہیڈ کوارٹر 'کمار' سے ایک بلند چوکی صنم تک لانے کے لئے ہیلی کاپٹر نے ۳۵ مرتبہ پرواز کئے جبکہ چیتاہ ہیلی کاپٹر نے ان کی خوراک پہنچانے کے لئے اڑان کیا۔ بلندی اور اکسیجن کی کمی کی وجہ سے لطیف ہوا میں ایک ہیلی کاپٹر صرف ایک جوان اور اس کا ہتھیار لے جا سکتا ہے۔ دوسرا ہیلی کاپٹر دو جوانوں کے روک سیک اور فاضل کپڑے لیتا ہے۔ دو جوانوں کو چوکی تک لینے کے لئے ایک ہیلی کاپٹر کو کم سے کم تین یا چار مرتبہ اڑان بھرنا پڑتا ہے۔ ایک اور ہیلی کاپٹر ان کا راشن اور دوسری ضروریات لیتا ہے۔ بریگیڈیئر ولیمز لکھتا ہے کہ یہ جاننا باعث دلچسپ ہوگا کہ ہلی کاپٹر کی ہر اڑان پر خزانہ عامرہ پر ۳۵ ہزار روپے کا بوجھ پڑتا ہے جو ۱۹۸۷ء میں ایک بڑی رقم تھی۔

دیکھ بھال چوکی کی طرف جاتے ہوئے گشتی دستے کے سارے جوان اور افسر مارے گئے۔ لیفٹیننٹ راجیو پانڈے ان کی قیادت کر رہا تھا۔ پاکستانی فوج نے اس چوکی کا نام قائد مشاہدہ چوکی رکھا تھا۔ بعد میں آپریشن راجیو پانڈے کے نام سے قائد چوکی پر حملہ کیا۔ ایک میجر کی سرکردگی میں ۵۰ جوانوں نے اس میں حصہ لیا۔ تین دن اور تین رات کی سخت لڑائی کے بعد اس پر قبضہ کیا۔ قائد مشاہدہ چوکی پر بہ مشکل ایک اگلو اور دو مورچوں کے لئے جگہ تھی اور اس پر چار جوان اور ایک جے سی او تعینات تھا۔ جب ہندوستانی جوان چوٹی پر پہنچے تو صرف دو زخمی جوانوں نے مزاحمت کی اور دست بدست لڑائی میں مارے گئے۔ نائب صوبیدار بانا سنگھ کو پرم ویر چکر سے نوازا گیا جس نے آخری مرحلے پر قیادت کی تھی۔ چوکی کا نام بدل کر بانا دیکھ بھال چوکی رکھا۔ پاکستانی حکومت نے قائد چوکی کے کمانڈر نائب صوبیدار عطا محمد کو بعد از مرگ ستارہ

جرأت عطا کیا۔

گلیشیر کی لڑائی عام لڑائیوں سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ فریقین کے فوجی ہر چوٹی پر اپنا جھنڈا گاڑنے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ لداخ اسکاؤٹس کے ایک جوان نے مجھے بتایا۔ ایک روز ان کی چوکی کے سامنے کی چوکی پر کئی ہیلی کاپٹر اترے۔ ان میں ایک ہیلی کاپٹر ان کی پوسٹ پر اترا اور پائلٹ نے باہر آ کر اطلاع دی کہ گلیشیر کے ایک طرف سے دشمن کے سپاہی ایک چوٹی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ پلاٹون کو فوری طور اس طرف جانے کا حکم ملا۔ لداخ اسکاؤٹس کے صوبیدار عبدالقادر کی سرکردگی میں پلاٹون روانہ ہوا۔ شام کے چھ بجے تھے۔ فروری کی ۲۱ تاریخ اور سن ۱۹۸۵ء تھا۔ منفی ۳۲ ڈگری میں برف و باد کے جھکڑ سہتے اور کھائیوں سے بچتے ہوئے ۱۲ گھنٹے چلنے کے بعد صبح کے پانچ بجے ان کا پاکستانی فوجی دستہ سے سامنا ہوا۔ جنہوں نے مارٹروں اور مشین گنوں سے فائر کئے۔ اسکاؤٹس کے جوانوں نے ایک ٹیلہ نما یخ کی آڑ میں پناہ لی اور کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔

بعد میں ۱۸ ہزار فٹ کی بلندی پر لداخ اسکاؤٹس کے جوانوں نے پاکستانی دستہ کی پیش قدمی روک لی اور جوابی حملہ کر کے پسپا کیا۔ اسکاؤٹس کے ایک جوان چھرنگ موٹوپ کو اشوک چکرا اور صوبیدار عبدالقادر کو سینا میڈل سے نوازا گیا۔ کئی اور جوانوں کو میڈل ملے۔

کئی مرتبہ دشمن کی پیش قدمی روکنے یا چوٹی تک پہنچنے کے لئے فریقین کو کئی اطراف سے گولہ باری کی ضرورت پڑتی ہے۔ بریگیڈیئر ولیمز رقم طراز ہے:

"عام طور پر ایک توپ سے ایک منٹ میں ایک سے دو گولے داغے جاتے ہیں۔ بیس کیمپ پر ۱۳۰ ملی میٹر ایک توپ سے ہر منٹ تقریباً چار سے پانچ گولے داغے جا رہے تھے۔ توپ کی نالی اتنی گرم ہوگئی کہ یہ پھٹ گئی اور توپچی ہلاک ہوئے۔"

فریقین نے جنگ بندی کے معاہدہ ہونے تک سیاچن کے مختلف پہاڑی ٹھکانوں

پر قابض ہونے کی کوششیں کی ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں چھومیک گلیشیر کے سامنے کی چوٹی پر قبضہ کرنے کے لئے دونوں گتھم گتھا ہوئے۔ پاکستان نے اپنے ایک افسر کپتان نویدالرحمٰن کو ہیلی کاپٹر سے رسّی کے ذریعے چوٹی پر آتارا۔ ہندوستان نے دھاوا بولا۔لیکن دونوں چوٹی پر ٹک نہیں سکے۔ آخرکار ہندوستان کی جنگ بندی کی پیشکش پر ۱۳رمئی ۱۹۸۹ء کو چھومیک کی لڑائی بند ہوئی۔ فریقین میں اس چوٹی کے لئے دوبارہ لڑائی نہ کرنے کا سمجھوتہ ہوااور سیاچن کا یہ مقام پہلا غیرفوجی بنا۔اس لڑائی میں ایک رپورٹ کے مطابق ۷۷ جوان زخمی ہوئے یا مارے گئے۔

۱۹۹۲ء میں پاکستان نے سیاچن کے جنوب مشرق میں ایک Ridge پر قبضہ کرنے کے لئے حملہ کیا۔ ۱۵ حملہ آور فوجی کام آئے۔ بریگیڈ کمانڈر مسعود انوری نے ایک لاما ہیلی کاپٹر میں صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے اڑان بھرا۔ ہیلی کاپٹر پر ایک میزائل لگا اور کمانڈر اور دو ہوا باز مارے گئے اور حملے کا ارادہ ترک کیا۔

سیاچن کی صورت حال نے دونوں ملکوں کو رسل ورسائل میں بہتری لانے کے لئے مجبور کیا۔ ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۶ء کے دوران پاکستان کی جانب بلافون، گیانگ، چولونگ اور کندوس کی وادیوں میں گلیشیروں کے دہانوں تک چھوٹی چھوٹی گاڑیوں کی آمدورفت کے لئے سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ اس کے دو سال بعد ۱۹۸۸ء میں سڑکوں کو چوڑا بنایا گیا جس سے ڈھیڑٹن وزن گاڑیاں گلیشیروں کے دہانے تک جانے کے قابل ہوئیں۔ ۱۹۹۰ء میں ہلکی گاڑیاں اگلی چوکیوں سے چند میل کے فاصلے تک آنے جانے لگیں۔ تب سے سڑکوں کو اور توسیع دی گئی۔ اسی طرح ہندوستان نے بھی بیس (Base) کیمپ تک پختہ سڑک بنائی ہے۔

بلتستان کی طرف سے اگلی چوکیوں تک رسائی مقابلتاً آسان ہے۔ لداخ کی وادی نوبراہ کی طرف سے بیس کیمپ سے گلیشیر تک پہنچنے کے لئے یکے بعد دیگرے چار کیمپ پڑتے ہیں۔ چوتھے کیمپ تک پہنچنے میں لگ بھگ دس گھنٹے لگتے ہیں۔ آخری کیمپ سے

چوٹی تک چڑھنے میں تین ساڑھے تین گھنٹے لگتے ہیں۔ بیس کیمپ سے گلیشیر کی چوٹی تک ۴۰ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ برف اور یخ بیس کیمپ سے ہی شروع ہوتے ہیں۔ انسان دنیا سے کٹ جاتا ہے اور ایک ایسی دنیا میں پہنچتا ہے جہاں چاروں طرف برف ہی برف ہے۔ ایسے ماحول میں انسان بوریت ہی محسوس نہیں کرتا بلکہ نفسیاتی کوفت (Depression) کا بھی شکار ہوتا ہے۔ اسی لئے سیاچن کے محاذ پر جوانوں کو تین مہینے سے زیادہ نہیں رکھا جاتا ہے۔ کسی کسی بلند چوکی پر صرف چار ہفتے رکھا جاتا ہے۔

سیاچن گلیشیر کی جنگ کا ایک مثبت پہلو بھی ہے۔ ہزاروں لوگوں کو روزگار فراہم ہوتا ہے۔ لداخ میں فوجی رسد، ساز وسامان وغیرہ کے نقل وحمل کے لئے ہزاروں لوگوں نے ٹرک خریدے ہیں جن سے مالی طور مالکان کو فائدہ پہنچا ہے اور ڈرائیوروں کو روزگار ملا ہے۔ مشقت خیز اور صبر آزما کام کے پیش نظر بار بردار قلیوں کو جگہ کی نوعیت کے مطابق ماہانہ ۲۵ ہزار روپے سے ۳۵ ہزار روپے کا مشاہرہ ملتا ہے۔

پاکستان کی طرف سے بھی سرحدی گاؤں لگ بھگ کٹے ہوئے تھے۔ زندگی کی ضروریات کی چیزیں جیسے کپڑا، چائے، مٹی کا تیل، نمک وغیرہ خریدنے کے لئے دشوار گزار پہاڑی تنگ راستوں سے ۳۰ میل دور خپلو جانا پڑتا تھا جہاں دریائے شیوق، دریائے کندوس اور دوسرے چھوٹے بڑے ندی نالے پڑتے تھے۔ جنہیں پار کرنا تکلیف دہ اور جاں جوکھوں کا کام تھا۔ اب ان گاؤں کا پختہ سڑک سے رابطہ قائم ہوا ہے۔ ان گاؤں کے لوگ پہلے بڑے غریب تھے۔ یہاں کاشت کاری کے لئے زمین محدود ہے اور سال میں ایک ہی فصل ملتی ہے۔ بلتستان کے دوسرے علاقوں کی طرح میوے پیدا نہیں ہوتے اس لئے یہ لوگ محنت مزدوری کے لئے اسکردو جاتے تھے۔ اب ان کو اپنے علاقے میں وسیلہ معاش نکلا ہے۔ اسکردو اور خپلو سے بھی لوگ کام کرنے کے لئے اب سولتورو اور کندوس آتے ہیں۔

۱۹۶۲ء کی ہند۔چین لڑائی کے بعد ہندوستان نے ملک کے دفاع کے لئے پہاڑی اور گلیشائی لڑائی کی ٹریننگ کی طرف دھیان دیا اور پہاڑی ڈویژن بنایا لیکن سیاچن نے نئے تجربات اور ضروریات سے آگاہ کیا۔ سیاچن کے بیس کیمپ Siachan Battle School قائم کیا جہاں گلیشیر پر رہنے، چلنے، چڑھنے اور لڑنے کے گر سکھائے جاتے ہیں۔ جوانوں کو روک سیک اٹھا کر یخ کی عمودی دیوار پر چڑھنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے لئے یخ کاٹنے کی کلہاڑی اور کنڈے کا ہونا لازمی ہیں۔ یخ کے شگاف سے ہر لمحہ کھائی میں گرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ فوجی پانچ سے چھ کے گروپ میں ایک دوسرے سے رسّی سے باندھے چلتے ہیں تاکہ کسی کے گرنے کی صورت میں اس سے سہارا دے کر نکالا جاسکے۔ کھائی پار کرنے کے لئے اس پر سیڑھی ڈالی جاتی ہے۔ ٹریننگ کے دوران جوانوں کو اگلو میں رکھا جاتا ہے تاکہ چوکی پر اگلو میں رہنے کی عادت پڑے۔

سونمرگ کے High Altitucde Warfare School میں بھی ٹریننگ دی جاتی ہے اور Sledge (برف گاڑی) پر بھاری سامان ڈال کر انہیں چلانا اور Ski سکھائی جاتی ہے۔

گلیشیر پر زندہ رہنے کی ٹریننگ سب سے مشکل ہے۔ ایک سپاہی کو برف کی کھائی میں ڈالا جاتا ہے۔ اور کم سے کم پانچ منٹ رکھا جاتا ہے۔ سپاہی سردی سے منجمد سا محسوس کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ اب مرا اب مرا۔ پھر ایک ہفتہ کے لئے پیٹھ پر راشن اٹھائے زوجی لا کے پاس مچوئی، کولوہو اور دوسرے گلیشیروں پر چلنا ہوتا ہے۔ بقا کے لئے نفسیاتی طور بردباری، حوصلہ اور استقامت کی تربیت ضروری ہے۔ اس کے بعد بیس کیمپ پر مزید لمبی ٹریننگ کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔

ایک سپاہی کی کٹ (Kit) میں عمر عیار کی زنبیل کی طرح بلندی اور گلیشیر پر کام آنے والے ۱۲۰ چھوٹے بڑے آلات اور چیزیں ہوتی ہیں۔ جن میں دو قسموں کے

آکسیجن کنٹینرز، تین قسموں کی یخ کی کلہاڑیاں، تین قسموں کے نقاب، چار قسموں کی رسیاں، پانچ قسموں کے اٹھاؤ اور دوسرے خیمے، چھ قسموں کے دستانے، چھ قسموں کی جرابیں، سات قسموں کے جاکیٹ اور پاجامے اور پینتیس قسموں کی کھونٹیاں اور کھپے وغیرہ شامل ہیں۔

ہندوستان ایک سپاہی پر اکیاون ہزار روپیہ خرچ کرتا ہے۔ مائیر امیکڈ ونلڈ نے دیکھا کہ ہر سپاہی کے پاس پندرہ جوڑی جرابیں تھیں۔ روس سے درآمد کیا ہوا ایک خیمہ تھا جس میں دو آدمی رہ سکتے تھے اور ایک موم بتی بھی اسے گرم رکھ سکتی تھی۔ کھانے کے لئے بہتر خوراک دی جاتی ہے۔ دونوں ممالک فوجیوں کو سیاچن پر خدمت کے لئے خصوصی الاؤنس بھی دیتے ہیں۔

۱۹۸۹ء سے دونوں ملکوں کے درمیان سیاچن گلیشیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے بات چیت ہوئی ہے۔ فریقین نے مختلف تجویزیں رکھی ہیں لیکن کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا ہے فلیگ میٹنگوں میں ہندوستان نے Nj۹۸۰۴۲۰ پوائنٹ سے آگے کوہ سلتورو پر دونوں فوجوں کی پوزیشنوں کی بنیاد پر لائن آف کنٹرول کی نشان دہی پر زور دیا۔ جبکہ پاکستان نے یہ مطالبہ کیا کہ سب سے پہلے دونوں ملکوں کی فوجوں کو ۱۹۷۲ء سے پہلے کی پوزیشنوں پر لوٹنا چاہئے اور پھر لائن آف کنٹرول کی نشان دہی کی بات کی جاسکتی ہے۔ جسے ہندوستان نے قبول نہیں کیا۔

شملہ معاہدہ کے تحت ۱۹۷۲ء سے جنگ بندی لائن، لاین آف کنٹرول میں بدل گئی۔

سکریٹریوں کی سطح کی میٹنگ میں ہندوستان نے سیاچن کو No Man Land قرار دینے کی تجویز رکھی جو پاکستان کو منظور نہیں تھا۔ ایک مرحلے پر ہندوستان نے سیاچن کو Demilitarized Zone یعنی مکمل طور پر فوجیں ہٹانے کی تجویز پیش کی۔ پاکستان نے اسے قبول نہیں کیا۔ پاکستان کے مطابق اس فارمولا کے تحت

پاکستان کی فوج حپلو سے آگے نہیں جا سکتی تھی۔ایک امریکی تجزیہ کار Robert Wirsing نے ۱۹۸۹ء میں The Siachsn Dispute کے عنوان سے راولپنڈی میں دونوں ملکوں کے درمیان سیاچن پر ہوئی پانچویں دور کی بات چیت پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے مطابق ہندوستان نے ذیل کی تجاویز پیش کی تھیں:

۱۔ پاکستان نقشہ کی جارحیت بند کردے۔

۲۔ سیاچن گلیشیر پر غیر فوجی علاقے کا تعین کرے۔

۳۔ موجودہ پوزیشن پر نقشوں کا تبادلہ کرے۔

۴۔ زمینی حقائق کی بنیاد پر پوائنٹ Nj ۹۸۴۲ سے شمال کی طرف چین کی سرحد تک سرحدی حد بندی۔

۵۔ مستقبل میں بطور آخری راستہ فوجی کارروائی کے لئے وجوہات کا تعین۔

۶۔ فریقین کی باہمی قبولیت کی بنیاد پر فوجوں کی دوبارہ تعیناتی۔

پاکستان نے دو تجاویز رکھیں:

۱۔ ۱۹۷۱ء سے پہلے کی جنگ بندی کے مقامات پر دونوں ملکوں کی فوجوں کی واپسی۔

۲۔ اسی کے مطابق سرحدوں کی حد بندی۔اگرچہ دونوں میں اختلافات تھے تاہم پاکستان کے خارجہ سکریٹری ہمایوں خان نے اعلان کیا تھا کہ سیاچن پر فریقین میں تصفیہ ہوا ہے۔اور اخباری خبر کے مطابق ہندوستان کے خارجہ سکریٹری ایس کے سنگھ نے اس کی تصدیق کی تھی۔لیکن ہندوستان کی وزارت خارجہ نے فوری طور اسی روز اس کی تردید کی۔

نومبر ۱۹۹۲ء میں نئی دہلی میں منعقدہ میٹنگ میں ایک اور مرتبہ سیاچن کا مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔فریقین نے غالباً یہ مان لیا تھا کہ فوجیں اپنی پوزیشنوں سے ہٹ جائیں گی اور ایک مشترکہ کمیشن بعد میں سرحدوں کی نشان دہی کرے گا لیکن اس

پرعمل نہیں ہوااور معاملہ تب سے جوں کا توں لٹکا ہے۔ ہندوستان کے دفاعی ادارہ کا کہنا ہے کہ سیاچن گلیشیر پر ہندوستان کی فوجی پوزیشن بہتر ہے۔اس لئے اس کو اسے دستبردار نہیں ہونا چاہیئے۔ ہندوستان اس تشویش کا بھی اظہار کرتا ہے کہ سیاچن خالی کرنے کی صورت میں ۱۹۹۹ء کی طرح پاکستان کرگل جیسی گھس پیٹ اور دراندازی سے سیاچن کی برفانی چوٹیوں پر کہیں قبضہ نہ کرلے۔ پاکستان ہندوستان پر الزام لگاتا ہے کہ اس نے اس پر ایک فضول جنگ تھوپی ہے۔

دونوں حکومتیں اپنے موقف پر قائم ہیں۔ گیہاری کے سانحہ کے بعد پاکستان کے بری فوج کے سربراہ جرنیل اشفاق پرویز کیانی نے بیان دیا تھا کہ دونوں ملکوں کو سیاچن کا مسئلہ حل کرنا چاہیئے لیکن اس کے فوراً بعد حکومت پاکستان نے اس ضمن میں اپنے موقف میں کسی تبدیلی سے انکار کیا ہے۔

چند افراد نے خاص کر خطے سے واقف کارکوہ پیماؤں نے ماحولیات کے تحفظ اور امن کے لئے سیاچن کو Pcace Park یعنی امن کا پارک بنانے کی تجویز رکھی جو پروان نہیں چڑھی۔

کئی دفعہ دفاعی تجزیہ کاروں اور صحافیوں نے لکھا ہے کہ جنگی اور دفاعی نقطہ نظر سے سیاچن گلیشیر کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ایک صحافی ارون چکو نے ۲/جولائی ۱۹۸۹ء کے انڈین ایکسپریس کی اشاعت میں ایک سینئر فوجی افسر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

''۱۹۸۴ء میں فوجی ملازمت سے ریٹائر ہونے والے چند اعلیٰ سینئر افسروں نے صرف اپنی ذاتی حیثیت منوانے اور کچھ کر دکھانے کے شوق میں ہندوستانی حکومت کو سیاچن گلیشیر میں فوجی کارروائی کا مشورہ دیا تھا۔اصل میں ایسی فوجی کارروائی کا قطعاً کوئی جواز نہیں تھا۔''

دونوں ملکوں کے سینئر افسروں نے جلد تاڑ لیا کہ سیاچن پر محاذ آرائی بیکار ہے۔

ایک فوجی تجزیہ کار بریگیڈ یئر گورمیت کنول نے ۲۰۰۷ء میں ایک مضمون میں لکھا ہے کہ جنگی لحاظ سے سیاچن بہت کم اہمیت رکھتا ہے۔ وزیر اعظم منموہن سنگھ نے سیاچن کو 'امن کا پہاڑ' بنانے کی بات کی تھی۔ تب فوجی سربراہ جرنیل بکرم سنگھ نے اس کی فوجی افادیت کو ابھارتے ہوئے کہا تھا کہ:

''ضرورت پڑنے پر سیاچن مستقبل میں شاہراہ قراقرم کے ساتھ محاذ آرائی کے لئے ایک اہم ٹھکانا ثابت ہوسکتا ہے اور بلتستان، اکسائی چین اور وادی شسگام پر پاکستانی اور چینی فوجوں کی نقل وحرکت کے لئے سدِّ راہ ہوسکتا ہے۔''

واشنگٹن میں تعینات جنوبی ایشیا کے ایک معروف تجزیہ کار Stephen Cohen نے سیاچن کی جنگ کو دو گنجوں کے درمیان ایک کنگھا کے لئے لڑائی بتایا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''سیاچن فوجی زاویہ نگاہ سے اہم نہیں ہے۔ ہندوستانی اور پاکستانی فوجیں وہاں محض نفسیاتی وجوہات پر موجود ہیں اور ایک دوسرے کی قوت ارادی کو آزما رہی ہیں۔''

ایک مغربی مبصر مار گولیس (Margolis) نے ۲۰۰۰ء میں یوں اپنا تاثر دیا ہے:

''صرف گہری نفرت انسانوں کو ایسی اجنبی، کم ہوا والی ویران، اونچی اور دہشت ناک مقام پر لڑائی کے لئے راغب کرسکتی ہے جس کے بارے میں ماہر کوہ پیما بھی دہشت اور خوفزدہ ہوکر باتیں کرتے ہیں لیکن ہندوستانی اور پاکستانی اس یخ بستہ پہاڑ پر پچھلی ایک دہائی سے لڑتے آرہے ہیں اور باز آنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے۔ یہ بڑے پیمانے کی جنگجویانہ دیوانگی ہے۔''

Myria MacDonald اپنی کتاب Height of Madness (دیوانگی کی انتہا) مطبوعہ ۲۰۰۷ء میں لکھتی ہے کہ سیاچن گلیشیر کی جنگ میں کوئی تک نہیں ہے۔ جو اس کی کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ وہ پہلے دہلی میں رائٹرز کی افسر اعلیٰ رہی تھی اور بعد میں بی بی سی کی نامہ نگار کے طور پر پاکستان اور ہندوستان کے دونوں

اطراف سے سیاچن گلیشیر اور اس پر تعینات فوجوں کی پوزیشن دیکھی تھی اور ان سے بات کی تھی۔ مائریا میکڈ ونلڈ گلیشیر پر جوانوں کو جسمانی طور پر کمزور، ہوب کی وجہ سے چہرہ سیاہ، برف سے بدن ورم زدہ اونفسیاتی طور پر مضطرب پاتی ہے۔ اور لکھتی ہے کہ موسم دونوں کا مشترکہ دشمن ہے جو لڑائی سے زیادہ جان لیتا ہے۔ مائریا سیاچن گلیشیر پر بلندی کی وجہ سے سوچنے اور مربوط جملے لکھنے سے قاصر محسوس کرتی ہے اور لکھتی ہے کہ بلندی سے حافظہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک ہی واقعہ کے بارے میں جوانوں کے چشم دید بیانات میں فرق پایا جاتا ہے۔ وہ لکھتی ہے:

''سیاچن سے بھوت پریت کے وجود پر یقین آ جاتا ہے۔ وہاں موجود افراد وہاں آنے والی ان سپاہیوں کی بدروحوں کے لئے ایک خالی بستر چھوڑ تے ہیں جو وہاں مرے ہیں۔''

اس ضمن میں مصنفہ نے وہاں تعینات ہندوستانی فوجیوں کے حوالے سے قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہے:

''بہتوں نے Ghosts دیکھے ہیں۔ (Ghosts سے مراد سیاچن پر مرنے والوں کی روحیں ہیں) وہ وردی کے بغیر ہوتے ہیں۔ ان میں ایک اوپی بابا ہے۔ (وہ ایک فوجی ہوتا ہے، جس کے نام پر ایک مندر بنا ہے) Base Camp پر اس کی تصویر ہے۔ یہ روحیں گلیشیر پر مرنے والوں کی ہیں اور ان کی جگہ آنے والوں کی حفاظت کر رہی ہیں۔ ان کے لئے کھانا رکھا جاتا ہے اور ایک فاضل بستر لگوایا جاتا ہے۔ ایک افسر نے جو اوپی بابا پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا، فاضل بستر لگوانے کی اجازت نہیں دی۔ دوسری صبح ایک سپاہی مندر میں پوجا کرنے گیا۔ بقول اس کے اوپی بابا سفید کپڑے میں نمودار ہوا اور بولا۔ 'میرا بستر کہاں ہے؟' ایک سپاہی وکرم بولا۔ ہر ایک آدمی اوپی بابا پر اعتقاد رکھتا ہے۔ جو کوئی اس پر سوال اٹھائے، اس کی سانس رکتی ہے یا شگاف میں گر جاتا ہے یا بیمار پڑ جاتا ہے۔

سائنس دان اس کو hullacination قرار دیتا ہے جو خوف، تھکن، کم آکسیجن اور خون میں شوگر کی کمی سے لاحق ہوتا ہے۔
سیاچن پر تعینات فوجی مخصوص آوازیں سننے کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ کچھ لوگ انہیں 'ییتی' (برفانی مخلوق) کچھ انہیں روحیں اور کچھ لوگ پہاڑی جن کہتے ہیں۔
بذاتِ خود گلیشیر سے ایک جداگانہ سا خوف طاری ہونے کی باتیں بھی کی جاتی ہیں۔"

مصنفہ لکھتی ہے کہ اس کو یقین آیا کہ یہ Apocryphal ہے۔ مصنفہ نے اوپی بابا کا مندر دیکھا، جس میں ہندوؤں اور سکھوں کے مذہبی صحیفوں کے علاوہ قرآن اور انجیل بھی رکھے تھے۔ مائرامکیڈ ونلڈ پہلی اور واحد غیر ملکی خاتون ہے جس کو ہندوستان اور پاکستان نے یکے بعد دیگرے سیاچن کے دورے کی اجازت دی۔ اس نے راستے سے ایک مرتبہ اور ہندو پاک کے ہیلی کاپٹروں سے دو مرتبہ سیاچن کے محاذ جنگ دیکھا اور فوجیوں سے تبادلہ خیال کیا۔ اسی دوران وہ چار مرتبہ لیہ آئی۔ وہ سیاچن پر جوانوں کے شب و روز کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتی ہے:

ایک سپاہی وکرم سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے بتایا کہ وہ مہینوں نہا نہیں پاتے اور نہ شیو کرتے ہیں۔ جو کپڑے پہنتے ہیں، اسی میں سوتے ہیں۔ روزانہ بیلچے سے برف صاف کرنا پڑتا ہے۔ رسالہ منوہر کہانیاں پڑھتے ہیں۔ ان کا ایک شغل تاش کھیلنا ہے۔ مہلت ملنے پر پوجا کے لئے مندر جاتے ہیں۔
پاکستانی سپاہی اردو ڈائجسٹ اور اخبار پڑھتے ہیں۔ اگرچہ اخبار ایک ہفتہ پرانا ہوتا ہے۔ آفیسران تاریخی اور جنگی ناول اور دوسری کتابیں پڑھتے ہیں۔ اسلام آباد ریڈیو اسٹیشن سے سیاچن پر تعینات جوانوں کے لئے ایک خصوصی پروگرام نشر ہوتا ہے۔ وہ چاکلیٹ کے بدلے گڑ کھانا پسند کرتے ہیں۔ نماز کے لئے انہوں نے پتھروں کے حصار میں جگہ بنائی ہے۔"

ماٹریا کہتی ہے کہ امن کی کسی بھی پہل کا خیر مقدم کرنا چاہئے اور فوجیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دیوانگی کی ان بلندیوں سے نیچے اتر آنا چاہئے۔

ٹائمز آف انڈیا میں ۲۱/ جولائی ۲۰۱۲ء کو ایک صحافی کانتی باجپائی نے ایک کالم میں لکھا ہے:

"جنگی لحاظ سے دنیا میں سیاچن کے لئے کدو کاوش فضول اور بیکار ہے۔ صرف ہندوستان اور پاکستان ہی اس پر سالانہ سینکڑوں کروڑ روپے اور انسانی جانیں ضائع کر سکتے ہیں۔ وزیر اعظم کو فوج کو صاف صاف کہنا چاہئے کہ جنگی نقطہ نظر سے یہ بالکل واہیات ہے اور اس بے ہودگی پر جونواں کی جان بلیدان بند کرنا چاہئے۔"

بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں روس کی توسیع پسند پالیسی نے روس اور برطانوی ہند کو جنگ کے دہانے پر لا یا۔ سیاچن گلیشیر کے تنازعے کو گریٹ گیم کی روشنی میں پرکھنے کی ضرورت ہے جس میں برطانوی ہند کا بڑا رول ہے۔ سنٹرل ایشیا کی آزاد اور خود مختار ریاستوں پر قابض ہونے کے بعد روس پامیر پہنچا جہاں سے برصغیر ہند کی سرحد قریب تھی۔ برطانوی ہند کی حکومت نے پامیر، چینی یا مشرقی ترکستان اور تبت جاسوس، سفارت کار اور دوسری ٹیمیں بھیجیں تا کہ روس کی توسیع پسند پالیسی سے برصغیر کو محفوظ رکھے۔ تاریخ میں اس کو گریٹ گیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں ۱۸۶۲ء میں برطانوی ہند کے خفیہ محکمے کا ایک افسر ٹی جی منٹگمری لداخ آیا اور ۱۸۶۵ء میں اس کی نگرانی میں لداخ اور چینی ترکستان کے درمیان پہاڑی سرحدوں کا سروے ہوا۔ اس نے ۱۸۶۹ء میں لیہ سے ایک پنجابی منشی محمد حمید کو جاسوسی اور خفیہ طور سروے کرنے کے لئے آلات کے ساتھ چینی ترکستان بھیجا۔ ۱۸۷۳ء میں پنڈت نین سنگھ کو اسی مقصد کے لئے لیہ سے تبت کی راجدھانی لہاسہ روانہ کیا۔ ان سے پہلے انگریز ولیم جانسن نے چینی ترکستان کا دورہ کیا تھا۔ انگریز افسر ڈوگلس فورسیتھ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۳ء میں سفارتی مشن اور جاسوسی پر چینی ترکستان

روانہ ہوا۔۱۸۷۳ء میں اس کے ہمراہ متعدد سول اور فوجی افسران اور ارکان عملہ تھے۔
اسی سال روسی فوج متحدہ ہندوستان کی سرحد کے قریب پامیر تک پہنچی تھی۔

فورسیتھ نے حکومت کو رپورٹ دی کہ روس پامیر پر حملہ کرے گا اور پاراکھیلی اور ایشاکومان دروں کو اپنے قبضے میں لے گا۔جس سے چترال، گلگت اور یاسین کو خطرہ ہوگا۔ پنجاب پہنچنے سے پہلے روسی فوج کو لداخ سے گزرنا پڑے گا۔ایک اور انگریز J. Biddulaph نے فورسیتھ کے خدشے کی توثیق کی۔لداخ میں تعینات انگریز جوئنٹ کمشنر اور ایک انگریز افسر ہیورڈ نے حکومت کو رپورٹ دی کہ لیہ کے شمال مشرق میں واقعہ ۱۸۰۰۰ فٹ بلند درہ چنگ لونگ حملہ آوروں کو لداخ آنے کے لئے چور دروازہ کا کام دے گا اس لئے اس درہ پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔لیہ میں تعینات دو برٹش جوائنٹ کمشنر نے ایلی آس (Ney Elias) اور کپتان ایچ رمزے نے حکومت کو مشورہ دیا کہ قراقرم سے شہیدولہ تک راستہ نہیں بنانا چاہیے تاکہ قراقرم یا چنگ چھنمو سے لداخ آنے کے راستے روسی جارحیت کے خلاف رکاوٹ بنے۔ان کی یہ دلیل تھی کہ راستہ بنانے کی صورت میں حملہ آور کو نقل وحرکت میں آسانی ہوگی۔شہیدولہ لیہ سے ۱۷۰ میل کے فاصلے پر لیہ چینی ترکستان کے تجارتی راستے پر واقع ہے۔

Ney Elias نے شہیدولہ اور کیون لین کے درمیان No Man Land پر قبضہ کرنے کا مشورہ دیا۔تاہم ایک اور انگریز افسر ہنسری والنس نے لکھا ہے کہ قراقرم درے کو عبور کر کے حملہ کرنا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔

۱۸۸۵ء میں پھر روسی فوج کی پیش قدمی کی اطلاع ملی۔خفیہ رپورٹ کے مطابق اس کی منزل لیہ تھی۔ برطانوی ہند حکومت نے یکے بعد دیگرے جاسوسی مہمات بھیجیں ۱۸۸۸ء میں ینگ ہاسبنڈ، ۹۲۔۱۸۹۱ء میں بوور، ۱۸۹۲ء میں لارڈ ڈینمور اور ۱۸۹۶ء میں دیلیے اور ملکولم کو صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے پامیر، تبت اور سنٹرل ایشیا روانہ

کیئے۔ان میں اکثر فوجی افسر تھے۔

اس تمہید کا ماحصل یہ ہے کہ گریٹ گیم کے کسی کھلاڑی نے سیاچن گلیشیر کی دفاعی افادیت کا تذکرہ تو درکنار، اس کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔سیاچن گلیشیر زوجی لا نہیں ہے جو سردیوں میں لداخ اور کشمیر کے درمیان ناقابل عبور دیوار کا کام دیتا ہے اور پرندہ تک پر نہیں مار سکتا۔گرمیوں میں بھی یہ ایک اہم دفاعی لائن ہے۔

لداخیوں اور بلتیوں نے آپس میں سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں دوسو سال تک لڑائیاں کیں،لداخی راجا جمیانگ نمگیل لڑتا ہوا اسکردو پہنچا اور بلتی راجا علی شیر خان فتح کا ڈنکا بجاتا ہو لیہ پہنچا۔انہوں نے سیاچن دیکھا بھی نہیں تھا۔۱۸۴۰ء میں جرنیل زور آور سنگھ بلتستان پر قابض ہوا۔اس کی فوج نے گرکونو،مورول اور ژے ژے تھنگ کے اطراف سے یلغار کی۔

۱۹۴۸ء میں پاکستان کی حمایت پر گلگت اسکاؤٹس کرگل کے راستے سے لیہہ سے ۱۲ میل دور ایک گاؤں ترو تک پہنچے اور دوسرے راستے سے وادی نوبراہ کے گاؤں ہونزیری تک پہنچے۔ انہیں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دشوار گزار سیاچن گلیشیر عبور کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ان کے علاوہ لداخ کی طرف پیش قدمی کرنے کے کئی اور بھی راستے تھے۔ جانکار ماہرین کے مطابق بلتستان کی طرف سے کرگل اور دراس

کے درمیان لیہ۔سرینگر قومی شاہراہ کو کئی مقامات پر منقطع کیا جاسکتا ہے لیکن چن پاکستان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔

ہندوستان کو مادی، عددی اور فوجی سازوسامان کے لحاظ سے پاکستان پر برتری حاصل ہے۔۱۹۶۵ء کی لڑائی میں پاکستانی فوج کو کرگل سے کئی میل پیچھے ہٹنا پڑا تھا اور ۱۹۷۱ء کی لڑائی میں بلتستان نے ۳۸۸ مربع میل علاقہ کھویا۔

البتہ اگر چین کا کوئی خطرہ ہے تو ان ہی راستوں سے ہے جن کا اندیشہ گریٹ گیم

کے کھلاڑیوں نے کیا ہے۔ کچھ تجزیہ کاروں نے کہا ہے کہ سیاچن پر تسلط رکھنے سے شاہراہ قراقرم پر دباؤ رکھا جاسکتا ہے۔وہ یہ نظرانداز کرتے ہیں کہ شاہراہ قراقرم سیاچن گلیشیر سے لگ بھگ ۲۴۰ کلومیٹر دور ہے۔

فی الحال سیاچن کا حل طلب تنازعہ لٹکا ہوا ہے۔ دراصل یہ دونوں ملکوں کے لئے قومی وقار کا سوال بنا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کب حل ہوگا۔ وہ دن برصغیر کے لئے بڑا نیک شگون ہوگا جب گل گلاب کا یہ برفانی کوہستان امن کا گہوارہ بنے گا۔جس کے رنگ برنگے گلاب کے پھولوں کو دیکھ کر کبھی مسافرون اورمہم جوؤں کا دل کِھل اٹھتا تھا۔

☆☆☆

طالب علموں سے دو باتیں

عبدالغنی شیخ

ہر انسان طالب علم ہوتا ہے، اس کا اطلاق علم کے ہر شیدائی پر ہوتا ہے۔ اکتساب علم میں عمر کی کوئی قید نہیں ہے، تاہم میرا روئے سخن خاص طور پر طالب علموں سے ہے جو تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

لغت میں علم کے معنی دانش، آگاہی، واقفیت، جوہر اور دانائی دیے ہوئے ہیں، لیکن موجودہ زمینی حالات بتاتے ہیں کہ تعلیم حاصل کرنے والے بے شمار ہیں اور اکتساب علم والے خال خال ہیں۔

کیمبرج کی ایک تقریب میں ایک ہندوستانی طالب علم کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی، وہ فخر سے بولا ''آج میرا حصول علم ختم ہوتا ہے'' اس کا استاد اور نگراں جو سامنے ایک نشست پر بیٹھا تھا برجستہ بولا ''اور میرا شروع ہوتا ہے'' ظاہر ہے یہ طالب علم کے لئے ایک کراری چپت تھی۔

روزگار کے سلسلے میں انٹرویو دینے کے لئے جنرل نالج قبیل کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں اور جب ملازمت مل جاتی ہے تو مطالعہ کو خیر باد کہہ دیا جاتا ہے۔ سول سروس کے امتحانات میں کامیاب ہونے والے اکثر امیدوار عموماً پڑھا کو ہوتے ہیں لیکن ملازم بننے کے بعد اکثر مطالعہ جاری نہیں رکھتے۔ اکتساب علم ایک مسلسل عمل ہے۔ حدیث ہے'' مہد سے لحد تک علم حاصل کرو'' تبتی زبان میں ایک مقولہ

ہے" اگر تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ آنے والا کل تمہاری زندگی کا آخری دن ہے تو آج کے دن بھی علم حاصل کرو"۔

ہمارے ناقص نظام تعلیم پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ یہاں تعلیم کا مدعا امتحان پاس کرنا ہے، زبان سکھانے کا مقصد یہ ہونا چاہیئے تھا کہ طالب علم اس زبان میں ہر لحاظ سے مہارت حاصل کرے، یعنی ٹھیک طرح سے اظہار خیال کر سکے۔ صحیح لکھ پڑھ سکے اور پڑھنے میں الفاظ و معانی سمجھ سکے لیکن ہمارے نظام تعلیم میں مخصوص اسباق کو رٹوا کر حفظ کرا کے امتحان پاس کرایا جاتا ہے۔ خاص کر بول چال کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا جاتا ہے۔

چند ماہرین تعلیم نے نظام تعلیم میں (MOTS) یعنی More of the same اور (HOTS) یعنی High order thinking skills کا نظریہ پیش کیا ہے۔ (MOTS) کے مطابق نظام تعلیم میں معمولی تبدیلی اور ترمیم لانی ہے۔ (HOTS) کا تقاضا ہے کہ نظام تعلیم میں وسعت لائی جائے اور سوچ وچار اور غور وفکر پر زور دیا جائے۔ غور وفکر کے ضمن میں کسی نے نامور سائنس داں آئیزک نیوٹن کے اس واقعہ کا حوالہ دیا ہے۔ جب وہ اپنے باغ میں ایک کرسی پر بیٹھا تھا، اچانک پیڑ سے ان کے سامنے ایک سیب گرا۔ نیوٹن نے سوچا کہ سیب زمین پر کیوں گرا؟ دائیں بائیں کیوں نہیں گرا، نیوٹن نے اس نکتے پر سوچا، تجربے کیے اور کشش ثقل کا تاریخ ساز نظریہ دریافت کیا۔

آپ نے انگریزی کی یہ کہاوت پڑھی ہوگی "زندگی قلیل ہے اور ارٹ طویل ہے۔ آج انسانی علوم وفنون کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہوا ہے کہ انسان مختصر زندگی میں علم کی کسی بھی شاخ کے خزینے سے مٹھی بھر اثاثہ سمیٹ سکتا ہے۔ میں نے بہت سال پہلے پڑھا تھا کہ ہر سال صرف طب پر چالیس ہزار مقالے لکھے جاتے ہیں۔ انہیں پڑھنے

کے لئے ایک اور زندگی چاہیے۔ نیوٹن نے کہا تھا میرے سامنے علم کا بے کراں سمندر ہے اور میں کنارے پر چند کنکروں سے کھیل رہا ہوں۔ علوم وفنون کا خزینہ انسان کے پچھلے آٹھ دس ہزار سال کی اجتماعی محنت اور ذہانت کا ثمرہ ہے۔ ایک انگریز دانشور روجر بیکن نے سولہویں صدی میں لکھا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب انسان فضا میں پرواز کرے گا، مچھلی کی طرح سمندر کی تہہ میں جائیگا اور ہزاروں میل دور بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کریں گے۔

انہیں نظریات پر انتھک اور بتدریج تجربے کئے گئے اور سائنس دانوں نے ہوائی جہاز، آبدوز کشتی اور لاسلکی ''وائرلیس'' ایجاد کیے۔ اس ضمن میں کہا جاتا ہے کہ بڑے لوگوں کے کندھے پر سوار ہو کر ہم ماضی میں جھانک سکتے ہیں اور ان کے کارناموں کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس چھوٹی سی زندگی میں ہمیں کسی بھی موضوع پر بہترین کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ چاہیے فنون لطیفہ ہو، تاریخ، فکشن ہو یا کوئی اور موضوع کے اچھی کتابوں کے انتخاب کے لئے اہل علم سے رجوع ہونا چاہیے اور ان کی رائے لینی چاہیے۔

ایک علمی کتاب میں علم وہُنر کی انمول باتیں ہوتی ہیں اور معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ایک تاریخی کتاب ہمیں ماضی کی سیر کراتی ہے۔ ایک اچھے فکشن میں اپنا تاثر ہوتا ہے جو دل و دماغ پر گہرا نقش چھوڑتا ہے، مطالعہ کے دوران ہم نئے الفاظ، محاورے اور معنی خیز جملے سیکھتے ہیں۔ انہیں ایک چھوٹے نوٹ بک میں جنہیں جیب میں رکھا جاسکے درج کرنا چاہیے، اور کتاب کے مرکزی خیال اور نفس مضمون یا متن کو اختصار سے ایک کاپی پر لکھنا چاہیے۔

انہیں کبھی بھی پڑھ کر ہم اپنی یادتازہ کر سکتے ہیں ایسے بھی کتب بین ہوتے ہیں جو پڑھتے بہت ہیں لیکن ان کی زبان صحیح نہیں ہوتی۔ چاہے تحریر ہو یا تقریر، اس کی وجہ

یہ ہے کہ وہ دھیان سے نہیں پڑھتے یا کچھ سیکھنے کے ارادے سے نہیں پڑھتے ہیں۔مولوی محمد حسین نے اس نسبت سے لکھا ہے کہ "بعض لوگ اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح بکریاں ادھر ادھر منہ مارتی ہیں، جدھر منہ پڑ گیا ایک بکٹا ابھر لیا، باقی کچھ خبر نہیں"

کئی کلاسیکل اور شاہکار کتابیں مشکل ہوتی ہیں How to read a book کے مصنف ڈاکٹر مورٹیمر جے ایڈلر نے لکھا ہے کہ مشکل کتاب کو ایک مرتبہ شروع سے آخر تک بلا ناغہ پڑھو، جزوی طور پر نہ پڑھو دوسری مرتبہ پڑھنے سے کتاب بہتر سمجھ میں آجائے گی۔ میرا مشاہدہ ہے کہ مغرب میں عمومی طور ہر کس و ناکس مطالعہ کا شوق رکھتا ہے، جو وہاں کے نظام تعلیم اور خانگی ماحول کی دین ہے۔میں نے سنا ہے کہ وہاں جب اہل علم ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو وہ یہ نہیں کہتے (How are you feeling بلکہ وہ یہ پوچھتے ہیں What are you reading these days? وہ تحفے میں عام طور پر کتابیں دیتے ہیں اور کتاب کے انتخاب میں قاری کے ذوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔بچوں کے لئے بچوں کے ادب پر وافر کتابیں ہیں۔

انسان نے آج علم اور سائنس میں بڑی ترقی کی ہے۔وہ چٹانوں کی عمر پڑھ سکتا ہے، پانی کی ایک بوند اور پھول کی ایک پتی میں پنہاں اجزا سے آگاہ ہے، انسان کے جسم کے ایک غیر مرئی خلیہ Cell کا تجزیہ کیا ہے۔جس میں کائنات چھپی ہے ،اس مضمون کو لکھنے سے چند روز پہلے کسی نے مجھے ایک کتاب بھیجی تھی، اس میں ایک جگہ قرآن مجید کی ذیل کی آیت کے حوالے سے مغرب میں سائنس کی ایک دوررس تحقیق کا تذکرہ تھا۔

"ایک چیونٹی نے کہا اے تمام چینٹیو! اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ

ہو کہ سلیمان کے لشکر تمہیں کچل دیں اور انہیں اس کا شعور بھی نہ ہو۔ (آیت نمبر ۱۱۸، سورۃ النمل ۲۷)

ویت نام کے گھنے جنگلوں میں ویتنامی گوریلوں کے شب خون سے امریکی فوجیوں کا بڑا جانی نقصان ہو رہا تھا۔ گوریلے جنگل کے راستوں سے واقف تھے اور حملہ کرنا ان کے لئے آسان تھا۔ اس صورتحال کا سامنا کرنے کے لئے امریکی سائنسدانوں نے کھٹمل کو بروئے کار لایا، سائنسی تحقیق کے مطابق کئی کیڑے مکوڑوں کی طرح کھٹمل کی قوت شامہ بڑی تیز ہوتی ہے، انسان کے پاس سے گزرتے تو انسان کے خون کی بو سونگھتا ہے، اور دوسرے کھٹملوں کو اپنی زبان میں اطلاع دیتا ہے کہ وہ انسانی خون چوسنے کی اس دعوت میں شریک ہو جائیں۔

امریکی سائنس دانوں نے ایک مخصوص کیپسول میں ایک ننھے سے ایمپلی فائر کے ساتھ زندہ کھٹمل رکھ دئے، لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے کھٹملوں کی آواز تقریباً دو فرلانگ تک جاتی تھی۔ امریکی فوجیوں نے ان کیپسول کو اپنے کیمپوں میں اور چوکیوں کے ارد گرد رکھا، جب گوریلے حملہ کرنے وہاں سے گزرتے تو امریکی خلیفہ چوکیوں تک کھٹملوں کی آواز پہنچتی تھی اور فوجی چوکنے ہو جاتے تھے۔ اس سے گوریلے حملے ختم ہو گئے۔ اس سے پہلے امریکہ نے کوریا کی جنگ میں بم پھینکنے کے لئے بندروں کا استعمال کیا تھا۔ بندر انسان کی نقالی کرتا ہے، ایک سپاہی گرنیڈ پھینکتا تھا اور دوسرے بندر اس کی نقل کرتے تھے اور دشمن پر گرنیڈ پھینکتے تھے، اور بے گناہ ان کی جانیں جاتی تھیں۔

ہر انسان کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں۔ ایک طالب علم کو اپنی درسی کتابیں پڑھنی ہوتی ہیں ، ایک ملازم کو دفتر کا کام ہوتا ہے، ایک گھریلو عورت امورِ خانہ داری میں مصروف رہتی ہے۔ مطالعہ اور تخلیقی کام کرنے کے لئے وقت کا صحیح استعمال Time

management کی ضرورت ہوتی ہے۔کامیاب انسانوں نے وقت کی قدر و قیمت کو سمجھا ہے،ٹینیسن نے ''انفارنو'' جیسی ضخیم کتاب کا لاطینی سے انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے چائے ابلنے کا وقت رکھا تھا۔چائے کی پتی کیتلی میں ڈال کر اس کے ابلنے تک جو مختصر وقت ملتا اس دوران وہ ترجمے کا کام کرتا تھا۔اس طرح انہوں نے یہ اہم کام ختم کیا۔مصروف سائنس داں لاوائزر وقت کی بچت کے لئے سیال خوراک استعمال کرتا تھا، متعدد شخصیتوں نے کم نیند کی ہے اور اٹھارہ گھنٹے کام کرتے تھے۔

سائنس اور علم کی ترقی کے ساتھ کئی پرانے نظریات غلط ثابت ہوئے ہیں۔ پرانی قدریں بدلی ہیں اور ان کی جگہ نئی قدروں نے لے لی ہے۔زمانہ وسطیٰ کے یورپ میں John Duns ایک مذہبی عالم اور فلسفی کی حیثیت سے مشہور تھا۔چنانچہ یونیورسٹی میں اس کے انتقال کے بعد دوسو سال تک اس کی نگارشات پڑھائی جاتی تھیں۔علمی حلقوں میں اس کی علمی تحقیق اور استدلال سے متاثر ہونے والے اور اس پر عمل کرنے والوں کو Duns men یا Dunse کہا جاتا تھا۔ Renaissance نشاۃ الثانیہ آئی تحقیق اور تدقیق اور انسانی فکر و نظر میں وسعت آئی اور John Duns کے نظریات کو دھکا لگا۔حتیٰ کہ Dunse یا Dunse جو کبھی بڑے ذہین لوگوں میں شمار ہوتے تھے، ایسے لوگوں کے ہم نوا گردانے گئے جو سیکھنے کے لائق نہیں ہیں اور ان میں بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کی خوبی نہیں ہے انگریزی میں غبی اور کند ذہن آدمی کے لئے Dunse کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔

ہر فرد کو کسی فن یا ہنر میں Excellance تفوق حاصل کرنا چاہیے، امریکی ادیب گراہم گرین لکھتا ہے کہ:

ہو کہ سلیمان کے لشکر تمہیں کچل دیں اور انہیں اس کا شعور بھی نہ ہو۔ (آیت نمبر ۱۱۸، سورۃ النمل ۲۷)

ویت نام کے گھنے جنگلوں میں ویتنامی گوریلوں کے شب خون سے امریکی فوجیوں کا بڑا جانی نقصان ہو رہا تھا۔ گوریلے جنگل کے راستوں سے واقف تھے اور حملہ کرنا ان کے لئے آسان تھا۔ اس صورتحال کا سامنا کرنے کے لئے امریکی سائنسدانوں نے کھٹمل کو بروئے کار لایا، سائنسی تحقیق کے مطابق کئی کیڑے مکوڑوں کی طرح کھٹمل کی قوت شامہ بڑی تیز ہوتی ہے، انسان کے پاس سے گزرتے تو انسان کے خون کی بو سونگھتا ہے، اور دوسرے کھٹملوں کو اپنی زبان میں اطلاع دیتا ہے کہ وہ انسانی خون چوسنے کی اس دعوت میں شریک ہو جائیں۔

امریکی سائنس دانوں نے ایک مخصوص کیپسول میں ایک ننھے سے ایمپلی فائر کے ساتھ زندہ کھٹمل رکھ دئے، لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے کھٹملوں کی آواز تقریباً دو فرلانگ تک جاتی تھی۔ امریکی فوجیوں نے ان کیپسول کو اپنے کیمپوں میں اور چوکیوں کے ارد گرد رکھا، جب گوریلے حملہ کرنے وہاں سے گزرتے تو امریکی خلیفہ چوکیوں تک کھٹملوں کی آواز پہنچتی تھی اور فوجی چوکنے ہو جاتے تھے۔ اس سے گوریلے حملے ختم ہو گئے۔ اس سے پہلے امریکہ نے کوریا کی جنگ میں بم پھینکنے کے لئے بندروں کا استعمال کیا تھا۔ بندر انسان کی نقالی کرتا ہے، ایک سپاہی گرنیڈ پھینکتا تھا اور دوسرے بندر اس کی نقل کرتے تھے اور دشمن پر گرنیڈ پھینکتے تھے، اور بے گناہ ان کی جانیں جاتی تھیں۔

ہر انسان کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں۔ ایک طالب علم کو اپنی درسی کتابیں پڑھنی ہوتی ہیں، ایک ملازم کو دفتر کا کام ہوتا ہے، ایک گھریلو عورت امورِ خانہ داری میں مصروف رہتی ہے۔ مطالعہ اور تخلیقی کام کرنے کے لئے وقت کا صحیح استعمال Time

management کی ضرورت ہوتی ہے۔کامیاب انسانوں نے وقت کی قدر و قیمت کو سمجھا ہے، ٹینیسن نے ''انفارنو'' جیسی ضخیم کتاب کا لاطینی سے انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے چائے ابلنے کا وقت رکھا تھا۔چائے کی پتی کیتلی میں ڈال کر اس کے ابلنے تک جو مختصر وقت ملتا اس دوران وہ ترجمے کا کام کرتا تھا۔اس طرح انہوں نے یہ اہم کام ختم کیا۔مصروف سائنس داں لاوائزر وقت کی بچت کے لئے سیال خوراک استعمال کرتا تھا، متعدد شخصیتوں نے کم نیند کی ہے اور اٹھارہ گھنٹے کام کرتے تھے۔

سائنس اور علم کی ترقی کے ساتھ کئی پرانے نظریات غلط ثابت ہوئے ہیں۔ پرانی قدریں بدلی ہیں اور ان کی جگہ نئی قدروں نے لے لی ہے۔زمانہ وسطیٰ کے یورپ میں John Duns ایک مذہبی عالم اور فلسفی کی حیثیت سے مشہور تھا۔چنانچہ یونیورسٹی میں اس کے انتقال کے بعد دوسو سال تک اس کی نگارشات پڑھائی جاتی تھیں۔علمی حلقوں میں اس کی علمی تحقیق اور استدلال سے متاثر ہونے والے اور اس پر عمل کرنے والوں کو Duns men یا Dunse کہا جاتا تھا۔ Renaissance نشاۃ الثانیہ آئی تحقیق اور تدقیق اور انسانی فکرونظر میں وسعت آئی اور John Duns کے نظریات کو دھکا لگا۔حتیٰ کہ Dunse یا Dunse جو کبھی بڑے ذہین لوگوں میں شمار ہوتے تھے، ایسے لوگوں کے ہم نوا گردانے گئے جو سیکھنے کے لائق نہیں ہیں اور ان میں بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کی خوبی نہیں ہے انگریزی میں غبی اور کند ذہن آدمی کے لئے Dunse کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔

ہر فرد کو کسی فن یا ہنر میں Excellance تفوق حاصل کرنا چاہیے، امریکی ادیب گراہم گرین لکھتا ہے کہ:

"لکھنا ایک قسم کا علاج معالجہ ہے۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ
وہ لوگ جو نہیں لکھتے مصوری یا دھنیں نہیں بناتے وہ کیسے
دیوانگی، مالی خولیا اور خوف سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ جو انسانی
فطرت میں داخل ہیں۔"

ایک آدمی ہر فن مولا تو نہیں بن سکتا تاہم ہر علم کی مبادات کو سمجھ سکتا ہے۔ برنارڈ شا لکھتا ہے۔ انسان کو ہر علم کی واقفیت ہونی چاہیے۔ادب میں متعدد تحریکیں چلی ہیں، کلاسیکل، رومانیت، نورومانیت، ترقی پسند، جدیدیت، پس جدیدیت پھر مغرب سے ساختیات اور پس ساختیات کا نظریہ آیا۔

فلسفہ ایک اہم موضوع ہے۔ مشرق کا اپنا فلسفہ ہے اور مغرب کا اپنا فلسفہ ہے۔ ہندو دھرم میں چھ درشن اور بدھ مت میں چار درشن کلیدی اہمیت رکھتے ہیں، اس طرح اسلامی فلسفہ ہے جس کی اپنی لمبی تاریخ ہے۔

ارسطو سے لے کر برٹرینڈ رسل تک مغرب میں متعدد فلسفی گزرے ہیں جنہوں نے سریت، تصوریت، تجربیت، رمزیت، علمیت اور وجودیت جیسے نظریات دیے ہیں جن سے ادب وفنون لطیفہ اور انسانی فکر ونظر پر اثر پڑا ہے۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ ہو، ادب کی مختلف اصناف میں بصیرت حاصل کی جائے، سیاسیات اور اقتصادیات نہایت اہم موضوعات ہیں۔ فلسفہ، سائینس اور مذہبی چند اہم نظریات کے لئے اصطلاحات وضع کی گئی ہیں جیسے علت ومعلول Cause and effect

جبر وقدر، وحدت الوجود اور وحدت الشہود وغیرہ یا سائینس کا نظریہ مقادیر ہے اکیسویں صدی کے ایک طالب علم کو ان کے معنی ومفاہیم جاننے کا تجسس ہونا چاہئے۔ایک کتاب Great Ideas Great Books میں ایک سو دو

Ideas یا تصورات دیئے ہیں۔جن میں ماسوائے چند مرئی اور ماورائی تصورات سارے مجرد تصورات ہیں جیسے صداقت ، شجاعت ، جمہوریت ، خوشی ، غم ، محبت ، علم کواہش ، تجربہ اقتصادیات نہایت اہم موضوعات ہیں۔آج سائینس کا بول بالا ہے۔ ان موضوعات کی بنیادی باتوں کا علم ضروری ہے۔بہت سے اہم نظریات اور نکات ہیں جن کے لئے اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔جیسے علت و معلول Cause and effect جبر وقدر، وحدت الوجود الشہود وغیرہ۔یا سائنس کا نظریہٗ اضافیت اورنظریۂ مقاد پر ہے۔اکیسویں صدی کے ایک طالب علم کو ان کے معانی و مفاہیم جاننے کا تجسس ہونا چاہیے۔

ایک کتاب Great Ideas Great Books میں ایک سو دو Ideas یا تصورات دیئے ہیں ،جن میں ما سوائے چند مرئی اور ماورائی تصورات سارے مجرو تصورات ہیں ، جیسے صداقت ،شجاعت،جمہوریت خوشی ،غم ،محبت ،علم ،خواہش ، تجربہ ،ظلم ،انصاف ، آزادی ،سزا ، جزاوغیرہ۔مجرو تصورات میں ہی بڑی طاقت ہے۔دنیا میں بڑے انقلابات مجرو تصوارت سے آئے ہیں ،صداقت کو لیجئے اس لفظ میں کتنے معانی پنہاں ہیں ،کتنی جان ہے،تاریخ گواہ ہے دنیا میں لاکھوں لوگوں نے صداقت کے لئے اپنی جان دے دی ، یا محبت کو لے لیں ،اس لفظ میں کتنی لطافت ہے، اس لفظ نے بیسویں امر داستانوں کو جنم دیا ہے، یا لفظ خوشی کو لیجئے اس پر ہزاروں صفحات سیاہ کئے گئے ہیں اور سینکروں کتابیں لکھی گئی ہیں ،ایک لفظ خواہش ہے،ترک خواہش بدھ دھرم کی بنیادی تعلیم ہے۔

فرصت کے لمحات کو ہمیں اچھے کام میں استعمال کرنا چاہیئے۔دو ہزار سال پہلے ارسطو نے کہا تھا ''وہ آدمی سب سے زیادہ خوش قسمت ہے جس کے پاس کافی جائداد ہے اور روزگار کے لئے کام نہیں کرنا پڑتا ہے ،وہ اپنا وقت فلسفہ،سیاست اور

حصول علم کے لئے دے سکتا ہے جس سے انسانی تہذیب کو فائدہ ہے۔"

ارسطو نے ذہنی کاوش کو فرصت کی سرگرمیوں سے تعبیر کیا ہے، جسمانی محنت کو روزگار سے وابستہ کیا ہے، ہم ارسطو کے دور کو اپنے زمانہ سے مقابلہ نہیں کر سکتے، تا ہم ارسطو کے مطمح نظر میں بھی اپنا وزن ہے۔

(تمام شد)

عبدالغنی شیخ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو افسانوی ادب کو زندہ رکھا اور اپنے افسانوں میں لداخ کے اطراف میں بکھری ہوئی زندگی اور زندگی سے وابستہ ان گنت واقعات اور حالات کو ایک منفرد انداز سے سمیٹا اور پیش کیا۔

نور شاہ

عبدالغنی شیخ لداخ کی دشت وسنگ سنسان برفانی سرزمین کی پیداوار ہے۔ آپ کا بچپن اور لڑکپن لیہ اور اس کے آس پاس کے اسی ماحول میں گزرا۔ آپ نے زوجیلا کے اس پار رہنے والے جفاکش اور تیرہ نصیب لوگوں کے درد کو اپنے وجود میں تحلیل کیا اور اپنے افسانوں اور ناولوں میں اس کا بھرپور اظہار کیا۔

جان محمد آزاد (سری نگر)

ABDUL GANI SHAIKH
Shakhsiat aur Adab

Edited by

Dr. Premi Romani

کچھ مرتب کے بارے میں



سبھاش ایمہ اصلی نام قلمی نام [illegible] کشمیر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مقامی اسکولوں [illegible] ام۔ حیات اورفن کے موضوع پر تحقیقی کام [illegible] ٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی [illegible] سے ''سہ ماہی عالمی میراث'' کے نام سے ایک [illegible] ع کرتے ہیں۔ ڈاکٹر پریمی رومانی اردو شعر وادب کے ایک [illegible] صلاحیت فنکار ہیں۔ انہوں نے ادبی سفر کا آغاز 1968ء میں شاعری سے شروع کیا۔ سب سے پہلی نظم ''تارے'' بچوں کے لئے لکھی جو مکتبہ جامعہ نئی دہلی کے زیر اہتمام شایع ہونے والے مقبول رسالے ماہنامہ ''پیام تعلیم'' میں شایع ہوئی۔ ان کا پہلا تحقیقی وتنقیدی مقالہ ''شہریار اور جدید نظم'' ماہنامہ شاعر ممبئی میں 1978ء میں شایع ہوا، جس کی سنجیدہ علمی و ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی، ادبیات کے الگ الگ موضوعات پر ان کی چار درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے علمی وادبی کارناموں کے پیش نظر یوپی اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی، انجمن ترقی اردو کشتواڑ، پریم سنگیت نکیتن، جموں رسا جاودانی میموریل لیٹریری سوسائٹی جموں، جگت گرو بھگوان گوپی ناتھ جی ٹرسٹ دہلی، وچار منچ دہلی اور اسباق ادبی ایوارڈ پونے (برائے شعر و ادب 2022) نے وقتاً فوقتاً گراں قدر اعزازات سے نوازا۔ ماہنامہ شاعر ممبئی نے ان کی شخصیت اورفن پر گوشۂ پریمی رومانی شایع کیا ہے ''عبدالغنی شیخ۔ شخصیت اور ادب'' ان کا تازہ ترین کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں شیخ صاحب کے مختلف النواع تحقیقی مقالات، افسانے، سفرنامے اور سیاچن گلشیر کے موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ شامل ہے۔ ان مقالات سے شیخ صاحب کے تخلیقی شعور کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ امید ہے کہ آپ اس کتاب کا نہایت ہی ذوق وشوق سے مطالعہ کریں گے اور اپنی گراں قدر رائے سے آگاہ کرنے کی زحمت کریں گے۔

ناشر

مدیر سہ ماہی عالمی میراث، پونے

موبائل : 7889930656

ABDUL GANI SHAIKH
Shakhsiat aur Adab

Edited by

Dr. Premi Romani

کچھ مرتب کے بارے میں



سبھاش ایمہ اصلی نام قلمی نام پریمی [illegible] کشمیر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مقامی اسکولوں [illegible] ایم اے۔ [illegible] حیات اور فن کے موضوع پر تحقیقی کام [illegible] نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی [illegible] سے ''سہ ماہی عالمی میراث'' کے نام سے ایک [illegible] کرتے ہیں۔ ڈاکٹر پریمی رومانی اردو شعر و ادب کے ایک [illegible] صلاحیت فنکار ہیں۔ انہوں نے ادبی سفر کا آغاز 1968ء میں شاعری سے شروع کیا۔ سب سے پہلی نظم ''تارے'' بچوں کے لئے لکھی جو مکتبہ جامعہ نئی دہلی کے زیر اہتمام شایع ہونے والے مقبول رسالے ماہنامہ ''پیام تعلیم'' میں شایع ہوئی۔ ان کا پہلا تحقیقی وتنقیدی مقالہ ''شہریار اور جدید نظم'' ماہنامہ شاعر ممبئی میں 1978ء میں شایع ہوا، جس کی سنجیدہ علمی و ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی، ادبیات کے الگ الگ موضوعات پر ان کی چار درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے علمی وادبی کارناموں کے پیش نظر یوپی اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی، انجمن ترقی اردو کشتواڑ، پریم سنگیت نکیتن، جموں رسا جاودانی میموریل لیٹریری سوسائٹی جموں، جگت گرو بھگوان گوپی ناتھ جی ٹرسٹ دہلی، وچار منچ دہلی اور اسباق ادبی ایوارڈ پونے (برائے شعرو ادب 2022) نے وقتاً فوقتاً گراں قدر اعزازات سے نوازا۔ ماہنامہ شاعر ممبئی نے ان کی شخصیت اور فن پر گوشۂ پریمی رومانی شایع کیا ہے''عبدالغنی شیخ۔ شخصیت اور ادب'' ان کا تازہ ترین کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں شیخ صاحب کے مختلف النواع تحقیقی مقالات، افسانے، سفرنامے اور سیاچن گلشیر کے موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ شامل ہے۔ ان مقالات سے شیخ صاحب کے تخلیقی شعور کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ امید ہے کہ آپ اس کتاب کا نہایت ہی ذوق وشوق سے مطالعہ کریں گے اور اپنی گراں قدر رائے سے آگاہ کرنے کی زحمت کریں گے۔

ناشر

مدیر سہ ماہی عالمی میراث، پونے

موبائل : 7889930656

ABDUL GANI SHAIKH
Shakhsiat aur Adab

Edited by

Dr. Premi Romani

کچھ مرتب کے بارے میں



سبھاش ایمہ اصلی نام قلمی نام پر [illegible] کشمیر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مقامی اسکولوں سے [illegible] انام۔ حیات اور فن کے موضوع پر تحقیقی کام [illegible] رسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی [illegible] سے ''سہ ماہی عالمی میراث'' کے نام سے ایک [illegible] شایع کرتے ہیں۔ ڈاکٹر پریمی رومانی اردو شعر و ادب کے ایک [illegible] صلاحیت فنکار ہیں۔ انہوں نے ادبی سفر کا آغاز 1968ء میں شاعری سے شروع کیا۔ سب سے پہلی نظم ''تارے'' بچوں کے لئے لکھی جو مکتبہ جامعہ نئی دہلی کے زیر اہتمام شایع ہونے والے مقبول رسالے ماہنامہ ''پیام تعلیم'' میں شایع ہوئی۔ ان کا پہلا تحقیقی و تنقیدی مقالہ ''شہریار اور جدید نظم'' ماہنامہ شاعر ممبئی میں 1978ء میں شایع ہوا، جس کی سنجیدہ علمی و ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی، ادبیات کے الگ الگ موضوعات پر ان کی چار درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے علمی و ادبی کارناموں کے پیش نظر یوپی اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی، انجمن ترقی اردو کشتواڑ، پریم سنگیت نکیتن، جموں رسا جاودانی میموریل لیٹریری سوسائٹی جموں، جگت گرو بھگوان گوپی ناتھ جی ٹرسٹ دہلی، وچار منچ دہلی اور اسباق ادبی ایوارڈ پونے (برائے شعر و ادب 2022) نے وقتاً فوقتاً گراں قدر اعزازات سے نوازا۔ ماہنامہ شاعر ممبئی نے ان کی شخصیت اور فن پر گوشۂ پریمی رومانی شایع کیا ہے ''عبدالغنی شیخ۔ شخصیت اور ادب'' ان کا تازہ ترین کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں شیخ صاحب کے مختلف النواع تحقیقی مقالات، افسانے، سفرنامے اور سیاچن گلشیر کے موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ شامل ہے۔ ان مقالات سے شیخ صاحب کے تخلیقی شعور کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ امید ہے کہ آپ اس کتاب کا نہایت ہی ذوق وشوق سے مطالعہ کریں گے اور اپنی گراں قدر رائے سے آگاہ کرنے کی زحمت کریں گے۔

ناشر

مدیر سہ ماہی عالمی میراث، پونے

موبائل : 7889930656